غمِ دوراں

غمِ دوراں

مرتبہ
غلام ربّانی تاباں

حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی

بار اوّل ۱۰۰۰

قیمت عہ

سنہ ۱۹۵۱ء

(نعمانی پریس دھلی)

19

فہرست

قحط بنگال

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

"غالب"

عرضِ مُرتب

ہماری قومی زندگی میں جب بھی کوئی بحران آیا تو ہمارے ادیبوں نے عوام کے شانے سے شانہ ملا کر اُسکے خلاف جنگ کی ہے۔ بنگال میں قحط پڑا تو ادیب ہی سب سے پہلے میدان میں اُترے انھوں نے ریلیف کمیٹیاں بنائیں چندے اکٹھا کیے اور اپنے قلم کی تمام قوت قحط زدہ بنگالیوں کی امداد کیلیے صرف کردی۔ آزادی کے نام پر جب ہمارے پاؤں میں دولت مشترکہ کی سنہری بیڑیاں ڈالی گئیں تو اس سازش کو بھی ادیبوں ہی نے بے نقاب کیا اور عوام کو بتایا کہ یہ آزادی نہیں بلکہ آزادی کے نام پر بورژوا لیڈروں نے سامراجیوں سے سمجھوتہ کرکے ہماری تحریک آزادی کے ساتھ غداری کی ہے۔ اور پھر وہ قیامت خیز زمانہ آیا جو اس سمجھوتہ کا لازمی نتیجہ تھا۔ چار طرف خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ بڈھے۔ بچے۔ عورت۔ مرد سب سفاکیوں کے شکار ہو رہے تھے اس وقت بھی ہمارے ادیبوں نے سب سے آگے بڑھکر اس دیوانگی کو روکنے کی مہم میں حصہ لیا۔ اس زمانہ میں ہمیں پے بہ پے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری عالمگیر جنگ سے پیدا شدہ حالات کیا کم تھے اس پر ایسے قباحت خیز سانحے پیش آئے جو کسی بھی قوم کی اخلاقی اور روحانی موت کے لئے کافی ہو سکتے تھے لیکن عوام سخت جان ہوتے ہیں۔ ہم آتش و خون کے طوفانوں کو پار کر آئے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ مشکلات ختم ہو گئیں ابھی تو بہت کچھ باقی ہے۔ اُفق پر گہرے بادل چھا رہے ہیں سامراجی ایک دفعہ پھر خون کی ہولی کھیلنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ایشیا کے عوام میں آزادی کی بڑھتی ہوئی لہر انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی چین۔ کوریا اور ویت نام کی آزاد عوامی جمہوریتیں ان کی نظروں میں کانٹے کی طرح

کھٹک رہی ہیں ادھر مشرق وسطیٰ میں ایران، مصر اور مراقش بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ سامراجی ان عوامی تحریکات کے خوف سے تیسری جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہیں تاکہ آزادی اور جمہوریت کی تحریکوں کو عوام کے خون میں غرق کر دیا جائے۔ اگر جنگ ہوئی تو ہمارا ادب۔ تمدّن اور ماضی کی تمام خوبصورت روایات ختم ہو جائیں گی۔ کیا ہم اس کے لئے تیار ہیں۔؟ کیا ہم سامراجیوں کو اس تباہی کی اجازت دیں گے۔؟ ایک دفعہ پھر وقت نے ہم سے کچھ سوال کئے ہیں جن کا جواب الفاظ چبا کر نہیں بلکہ صاف صاف دینا ہے۔ اپنی شاندار روایات کے پیش نظر ہم صرف ایک ہی جواب دے سکتے ہیں اور وہ ہے —— نہیں —— مگر یہ جواب تو کافی نہیں۔ سامراجیوں کی اس زبردست سازش کو شکست دینے کے لئے ہمیں انتھک کوشش کرنی ہوگی۔ معرکہ بڑا ہے —— دشمن چالاک بھی ہے اور سفاک بھی —— اس کے وسائل لامحدود اور قوت بے پناہ ہے لیکن اس کے باوجود مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ دُنیا کے امن پسند عوام ہمارے ساتھ ہیں اور یہ وہ قوت ہے جس کا مقابلہ دُنیا کی کوئی دوسری قوت نہیں کر سکتی۔ ہمیں کتنی ہی دشواریوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ آخری فتح عوام کی ہوگی اور دُنیا سے بھوک۔ غلامی اور قتل و غارت کی لعنتیں ہمیشہ کے لئے دور ہو جائیں گی۔

اس کتاب میں قحط بنگال۔ آزادی اور فسادات پر نظمیں شامل ہیں۔ اس کی ترتیب قدرے عجلت میں ہوئی اور اس لئے اس کا امکان ہے کہ بہت سی اچھی اچھی نظمیں اس انتخاب میں نہ آسکی ہوں۔ میں اپنے ان تمام ساتھیوں سے معذرت طلب ہوں جنکا کلام اس میں شامل نہ ہو سکا۔

غلام ربّانی تاباں

جامعہ نگر۔ دہلی
۲۶ ستمبر ۱۹۵۱ء

قحط بنگال

احمد ندیم قاسمی

ہیضہ

[بنگال کے ویران پس منظر پر ایک نقش]

سنسناتا ہوا اِک تیر چلا
گنگنانے لگی پہنائے عرش
تارے گھبرائے اُچھل کر ٹوٹے
تیر کی منزلِ مقصود تھی فرش

سرسراتی ہوئی تاریکی میں
اِک دمکتی ہوئی ڈوری بُنتا
چیرتا آیا خلاؤں کے جگر
اور ہواؤں کے کلیجے دُھنتا

وہ قریب آیا، وہ ٹھٹکا، وہ رُکا
وہ تڑپنے لگا افعی کی طرح،
وہ تڑپتے ہوئے پلٹا لپکا
تیز اک کوندے کی بجلی کی طرح

تیر انداز نے آنکھیں مل کر
تیر کو دیکھ کے اک آہ بھری
ایک سیّارے پہ ترکش پھینکا
اور کماں توڑ کے شانے پہ دھری

تیر سرگوشیاں کرتا آیا
"تو نے کیا ظلم کیا تھا آقا!
کیا ضرورت تھی نئے تیروں کی
واپس آلے مرا ہمدم ـــ فاقہ"

اختر الایمان

ایک سوال

زمیں کے تاریک گہرے سینے میں پھینکدو اس کا جسمِ خاکی!
یہ سیمگوں نرم نرم کرنیں،
جو ماہ و انجم سے پھوٹتی ہیں
یہ نیلگوں آسماں کی دُنیا
یہ شرق اور غرب کے کنارے
یہ میوہ ہائے لذیذ و شیریں
یہ حسنِ بے نام کے اشارے
کبھی نہ اس کو جگا سکیں گے

جوان، دلکش، حسین چہرے سے چھین لی غم نے تابناکی!
کھلی ہوئی بدنصیب آنکھیں
یہ دیکھتی تھیں کہ آدمی نے
اِک اپنے ہی جیسے آدمی پر
تمام دروازے بند کر کے
بہیمیت کو جگا دیا ہے
لذیذ انبار نعمتوں کے
سیاہ پردوں میں دب گئے ہیں
اور آخر ش راندۂ جہاں سے زمیں کی آغوش نے وفا کی!
اِسی لئے کیا اُگا گریں گے
یہ نرم پودے، یہ نرم شاخیں
کہ ان کو اِک روز ہم اُٹھا کر
خزاں کی آغوش میں سُلا دیں

اختر انصاری

کلکتہ

نازنینوں کا یہ نازِ دل فریب
درد مندوں کا مداوا ہی سہی
جگمگاتی شاہراہوں کا یہ نور
تیرہ بختوں کا اُجالا ہی سہی
یہ تماشا گاہوں کی رنگینیاں
نا اُمیدوں کا سہارا ہی سہی
یہ طرب خانوں کی دُنیائے نشاط

قحط کے ماروں کی دنیا ہی بھی

دل کی حیرانی کو ہمدم! کیا کروں
اپنی نادانی کو ہمدم! کیا کروں

اختر شیرانی

فاقہ کشانِ بنگال

خوں رُلاتا ہے غمِ فاقہ کشانِ بنگال
اشک بنجاتی ہے آنکھوں میں فغانِ بنگال!

کس کو پروا ہے سُنے کون فغانِ بنگال
قہرِ بنگال، بہر حال، بجانِ بنگال!

سلک و ریشم تھا گراں جنکے بدن پر اک دن
آج عُریاں ہیں وہی سرو قدانِ بنگال!

صرصرِ قحط و وبا، آفتِ سیل و طوفاں
اک مصیبت میں نہیں کشتیِ جانِ بنگال!

آہ بھی بھوک کے مارے نہیں آتی لب تک
کوئی کیونکر سنے فریاد و فغانِ بنگال!
قحط کے ساتھ یہ سیلاب خبر دیتے ہیں
موت بھی روتی ہے اب بہرِ بتانِ بنگال!
ملک کے واسطے مرتے تو کوئی بات بھی تھی
غیرت اے مرگ مصیبت زدگانِ بنگال!
پیاری اولاد کی قیمت ہوں فقط دو لقمے!
رحم اے خالقِ کل گرسنگانِ بنگال!
جن فضاؤں میں مچلتے تھے کبھی نغمۂ تر
اب تڑپتی ہے وہاں آہ و فغانِ بنگال!
بھوک کی آگ ہی میں جل بجھے جلنے والے
نہیں محتاجِ چِتا، فاقہ کشانِ بنگال!
ابر کے پردے میں گم ہے فلکِ نیلی پوش
کہ کفن مانگ نہ لیں بے کفنانِ بنگال!
اختر اربابِ وطن رہ نہیں سکتے خاموش
حالِ بنگال سنیں گر بزبانِ بنگال!

جگر مرادآبادی

بنگال

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں

افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ
بے گور و کفن خاک بہ سر دیکھ رہا ہوں

بچّوں کا تڑپنا وہ بلکنا وہ سسکنا
ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں

انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیرِ تاباں
ہونے کو ہے اس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں

خاموش نگاہوں میں اُمنڈتے ہوئے جذبات
جذبات میں طوفانِ شرر دیکھ رہا ہوں

بیداریٔ احساس ہے ہر سمت نمایاں
بیتابیٔ اربابِ نظر دیکھ رہا ہوں

انجامِ ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے
میں صاف ان آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں

صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن
صیاد کا جلتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں

اِک تیغ کی جنبش سی نظر آتی ہے مجھکو
اِک ہاتھ پسِ پردۂ در دیکھ رہا ہوں

سردار جعفری

بنگال

آبروئے ملک و ملّت کے نگہبانو اُٹھو
شمعِ جاں افروزِ آزادی کے پروانو اُٹھو
حرّیت کے پاسباں، عزّت کے دیوانو اُٹھو
مادرِ ہندوستاں کے دل کے ارمانو اُٹھو

نازِ ہے تلوار کو جس پر وہ بازو ہو تمہیں
وہ بہادر بھیم وہ خوددار ٹیپو ہو تمہیں

آج ہے بدلا ہوا رنگِ مزاجِ روزگار
گرگسوں کی طرح منڈلاتی ہے روحِ انتشار

آہ وہ بنگال وہ حسن و محبت کا دیار
ہو گیا غیروں کی دیرینہ سیاست کا شکار
اس مصیبت میں اگر اپنے بھی بیگانے رہے
"فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے"

جس افق سے روز ہوتا ہے طلوعِ آفتاب
جس نے پالی اپنے گہوارے میں روحِ انقلاب
جسکے فرزندوں نے دی تحریکِ آزادی کو آب
جس حسیں وادی میں شادابی بجاتی تھی رباب
آج اُس میں قحط ہے آلام ہیں ادبار ہے
زندگی سے آج اُسکا ہر نفس بیزار ہے

تم ابھی اُلجھے ہو بحثِ اندک و بسیار میں
اور وطن ہے صیدِ دامِ سکّہ و دینار میں
ایک سکتے کا سا عالم ہے درودیوار میں
جسم کس کے بک رہے ہیں کوچہ و بازار میں؟

چند ٹکڑوں کے لئے جھانسی کی رانی بک گئی،
آبرو مریم کی! سیتا کی جوانی بِک گئی!!

بستیوں میں گاؤں میں شہروں میں لہراتی ہے موت
جس طرف دیکھو اُسی جانب نظر آتی ہے موت
چھین کر بچّوں کو ماؤں سے لئے جاتی ہے موت
سرنگوں ہے زندگی اور ناز فرماتی ہے موت

گاؤں ویراں ہو گئے، ہر جھونپڑا سنسان ہے
خطّۂ بنگال ہے یا ایک قبرستان ہے

دھنس گئی ہیں بھوک سے آنکھیں دھنستے جاتے ہیں گال
ہڈیوں پر خشک چمڑے کی طرح لپٹی ہے کھال
ماؤں کے دُکھتے ہوئے شانوں پہ بچّے ہیں نڈھال
جانور سے بھی ہے بدتر آج انسانوں کا حال

جھونپڑے کل تک تھے جنکے مرغزاروں کے قریب
آج وہ دم توڑتے ہیں رہ گذاروں کے قریب

سیکڑوں سڑتی ہوئی لاشوں سے اُٹھتا ہے بُخار
میّتیں ہیں بے کفن چادر اُڑھاتا ہے غبار
چھاتیاں ماؤں کی جن سے دودھ کی بہتی تھی دھار
بے بسی سے آج اُن کو چوستے ہیں شیر خوار
رینگ کر لاشوں سے ہٹ جانے کی طاقت بھی نہیں
ان میں انسانوں کی ہلکی سی شباہت بھی نہیں

خلوتیں سُونی ہیں، سُونی محفلِ احباب بھی
آج ویراں ہے حرم اور دیر کی محراب بھی
شوق بھی زخمی ہے زخمی ہے دلِ بیتاب بھی
ساز بھی ٹوٹا ہوا ٹوٹی ہے مضراب بھی
اس بھیانک خامشی کے درمیاں گائیگا کون؟
اس اندھیرے میں چراغِ طور دکھلائیگا کون؟

مشعلِ اُمید سینوں میں جلا سکتے ہو تم
قحط کی اور موت کی گردن دبا سکتے ہو تم

نیند کے ماتے جوانوں کو جگا سکتے ہو تم
خود مسیحا بن کے مُردوں کو جِلا سکتے ہو تم
زندگی کرتی ہی جب یورش تو گھبراتی ہی موت
زندگی سے بھاگنے والوں پہ چھا جاتی ہی موت

اِک طرف دیوِ حکومت گردنوں پر ہے سوار
اِک طرف جاپان کا لشکر قطار اندر قطار
اور اس حالت میں ہندوستان فاقوں کا شکار
ہوشیار اے مردِ میدانِ سیاست ہوشیار

ایک ہو جاؤ کہ دم سینوں میں گھٹ جانے کو ہی
قوم کا سرمایۂ اخلاق لُٹ جانے کو ہی

متحد ہو کر اُٹھو جس طرح دریا میں اُبال
متحد ہو کر بڑھو جس طرح صحرا میں غزال
متحد ہو کر اُڑو جس طرح شاعر کا خیال
متحد ہو کر چلو مانندِ بادِ برشگال

پھر بہار آ جائے شاخِ آرزو پھلنے لگے
کھیتیاں شاداب ہو جائیں ہوا چلنے لگے

شاہد صدیقی

گیتوں کی بستی میں — نوحے

اِک عُمر سے ہے دُنیائے وطن ناکام نظاموں کی دُنیا
مغرور دماغوں کی محفل مجبور غلاموں کی دُنیا
اخلاق کی بے پردہ لاشوں پر چشمِ حمیت روتی ہے
ناداری کے بازاروں میں عزّت کی تجارت ہوتی ہے

اُس مُلک میں انسانیت کے فرمان سنائے جاتے ہیں
مرتے ہوئے انسانوں کو جہاں چوپائے کھائے جاتے ہیں
جانوں کا یہاں کچھ ذکر نہیں عزّت کی نشانی ارزاں ہے
ماؤں کا تقدس ارزاں ہے بہنوں کی جوانی ارزاں ہے

جینے کا سبب بننے والے مرنے کی تمنّا کرتے ہیں
اس دُنیا میں بھوکے ہیں وہی جو غلّہ پیدا کرتے ہیں

آنسو آنکھوں میں جھلکتے ہیں فریادیں لب تک آتی ہیں
جب پیٹ کا دوزخ بھرنے کو اولادیں بیچی جاتی ہیں

بنگال کا سورج یوں چمکا سب لُطف شبانہ لوٹ لیا
فاقوں کی مسلسل آفت نے نغموں کا خزانہ لوٹ لیا

ہر گام پہ کچھ اُفتادیں ہیں ہر موڑ پہ کچھ بیدادیں ہیں
ان گیتوں کی آبادی میں فریادیں ہی فریادیں ہیں

غلام ربّانی تاباںؔ

پڑوسن

صرف آواز سُنی ہے اُس کی
شب کی تنہائی میں کیا گاتی ہے — کیوں گاتی ہے — کون کہے ؟
زمزمہ سوز بھی ہے ساز بھی ہے
پردۂ راز بھی غمّاز بھی ہے
کتنا غمگین ہے لہجہ اُس کا
درد میں ڈوبا ہوا
ایک تصویر سی کھنچ جاتی ہے
دشت بے آب و گیاہ

اور سڑتی ہوئی گلتی ہوئی لاشیں ہر سمت
چیلیں منڈلاتی ہوئیں — پنجے کھولے ہوئے پر تولے ہوئے،
وادیٔ مرگ —
اجنبی گیت — بم وزیر کا اک سیل رواں
جیسے سیاروں کا نغمہ کہ سمجھ بھی نہ سکوں
(کوئی کہتا تھا کہ بنگالن ہے)
ہو گی..... مجھے کیا معلوم —؟

کمال احمد صدیقی

قحطِ بنگال

ہائے دوشیزۂ بنگال کی یہ دھج اۓ دوست!
جسکی زلفوں کے خنک سائے میں ٹیگور کے گیت
پیہم انگڑائیاں لیتے تھے بہاروں کی طرح!
جسکے ترشے ہوئے ہونٹوں کی دل آویزی میں
نذرالاسلام کے نغمات رچے رہتے تھے
لالۂ و گُل کے شفق بار شراروں کی طرح!
ہائے دوشیزۂ بنگال کی یہ دھج اۓ دوست
آج اس پر کسی بیوہ کا گماں ہوتا ہے!

بھوک نے اس کے جواں جسم کی رعنائی کو ـــــ
اتنا روندا ہے کہ اب بھوک کی تصویر ہے وہ!
جو حسین جسم ستاروں نے بھی دیکھا نہ کبھی،
آج احساس نہیں ہے اسے عریانی کا ـ
سرِ بازار چلا آیا ہے بکنے کیلئے!
اور وہ آنسو جو گہر سے بھی ہیں قیمت میں سوا
آج بے سود بہا کرتے ہیں چاول کیلئے!!

جن قوی ہاتھوں نے کل دھان کیا تھا پیدا ـ
وہی پژمردہ ہیں سوکھے ہوئے پودوں کی طرح!

کھلے بازار میں نایاب ہے چاول ـــــ لیکن
چور بازار میں، بیوپار، ہوا کرتا ہے
اور کلکتہ کے بازاروں میں ہر روز اے دوست
لاکھوں فاقہ زدہ انسان مرا کرتے ہیں!

میں نے دیکھے ہیں سرِ راہ ہزاروں لاشے
مر گئے سیکڑوں جگدیش ہزاروں ٹیگور!
سیم اور زر کے خداوندوں کا لایا ہوا قحط
ارضِ بنگال کو شمشان کیے دیتا ہے،
حسن کی گود کو ویران کیے دیتا ہے!

اِن زر و سیم کے ناگوں کو کچلنا ہوگا۔
ورنہ یہ ہم کو یونہی ڈستے رہیں گے اے دوست!!

کیفیؔ اعظمی

کلکتہ

"کلکتہ جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے"
رستوں پہ رینگتے ہوئے بھوک کے ہزار حیف
غربت کا جاں گداز نظارا کہ ہائے ہائے
وہ خاک پر بلکتے ہوئے طفل جاں بہ لب
وہ ڈوبتا ہر ایک ستارا کہ ہائے ہائے
بچے، جوان، عورتیں بے آس ہیں سبھی
آرام اس طرح سے سدھارا کہ ہائے ہائے

سڑکوں پہ وہ پڑی ہوئی بھوکوں کی میتیں
لاشوں سے پُر ایک کنارا کہ ہائے ہائے
ہوتی ہوئی تباہ وہ گنجان بستیاں
چڑھتا ہوا وہ قحط کا دھارا کہ ہائے ہائے
انساں ترس رہے ہیں نوالے کے واسطے
جینے کا یوں مٹا ہے سہارا کہ ہائے ہائے
جلتے ہوئے وہ پیٹ وہ آنکھیں دھنسی ہوئی
بھڑکا ہوا قضا کا شرارا کہ ہائے ہائے
وہ قحط و بے کسی وہ حکومت کی بے حسی
وہ تاجران مست و خود آرا کہ ہائے ہائے
لٹکے ہوئے گداموں میں وہ قفل آہنی
وہ نفع کا ذلیل نظارا کہ ہائے ہائے
کیفی تڑپ اٹھی ہیں وطن کی جماعتیں
بھوکوں نے اس طرح سے پکارا کہ ہائے ہائے

مخدوم محی الدین

بنگال

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگرس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

وہ درِ ہندوستاں، وہ سحر و نغمے کا دیار
دیدنی ہے آج اُس کی ناتوانی کی بہار
بھوک کا بیماریوں کا، بم کے گولوں کا شکار
پیٹھ میں جاپان کا خنجر تو سر پر سود خوار

قبر کے روزن سے اپنا مُنہ نکالا موت نے
بے سہارا جان کر مارا ہے بھالا موت نے
خاندانوں کو بنا ڈالا نوالا موت نے
شیر خواروں کو چبا کر تھوک ڈالا موت نے

اُمّتِ مرحوم ہو یا ملّتِ زنّار دار
اُن کے فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار
مرد و زن، شیخ و برہمن سب قطار اندر قطار
آہ سوکھی چھاتیوں کی چیخ، بچّوں کی پکار

آج اپنا گھر عدو کی رہگذر ہی کیوں نہ ہو
ہم بڑھے جائیں گے رستہ پُر خطر ہی کیوں نہ ہو
ہم لڑے جائیں گے دُشمن بد گہر ہی کیوں نہ ہو
اپنی دردی خاک خوں میں تر بتر ہی کیوں نہ ہو

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگرس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

وامق جونپوری

بھوکا ہے بنگال

پورب دیس میں ڈگی باجی — پھیلا دکھ کا جال
دکھ کی اگنی کون بجھائے — سوکھ گئے سب تال
جن ہاتھوں نے موتی رولے — آج وہی کنگال رے ساتھی — آج وہی کنگال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی — بھوکا ہے بنگال

پیٹھ سے اپنے پیٹ لگائے — لاکھوں الٹے کھاٹ
بھیک منگائی سے تھک تھک کر — اترے موت کے گھاٹ
جیون مرن کے ڈانڈے ملائے — بیٹھے ہیں چنڈال رے ساتھی — بیٹھے ہیں چنڈال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی — بھوکا ہے بنگال

ندی نالہ گلی ڈگر پر — لاشوں کے انبار
جان کی ایسی مہنگی شے پر — اُلٹ گیا بیوپار
مُٹھی بھر چاول سے بڑھکر — سستا ہے یہ مال رے ساتھی — سستا ہے یہ مال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی — بھوکا ہے بنگال

کوٹھریوں میں گانجے بیٹھے — بنئے سارا ناج
سُندر ناری بھوک کی ماری — بیچے گھر گھر لاج
چوپٹ نگری کون سنبھالے — چار طرف بھونچال رے ساتھی — چار طرف بھونچال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی — بھوکا ہے بنگال

پُرکھوں نے گھر بار لُٹائے — چھوڑ کے سب کا ساتھ
مائیں روئیں بلک بلک کر — بچے بھئے اناتھ
سدا سہاگن بدھوا باجے — کھولے سر کے بال رے ساتھی — کھولے سر کے بال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی — بھوکا ہے بنگال

انی پتی چبا چبا کر — جوجھ رہا ہے دیس
موت نے کتنے گھونگھٹ مارے — بدلے سو سو بھیس
کال بکٹ پھیلائے رہا ہے — بیماری کا جال رے ساتھی — بیماری کا جال

بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

دھرتی ماتا کے سینے میں چوٹ لگی ہے کاری
مایا کالی کے پھندے میں وقت پڑا ہے بھاری
اب سے اُٹھ جا نیند کے ماتے دیکھ تو جگ کا حال رے ساتھی دیکھ تو جگ کا حال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

آزادی

احمد ندیم قاسمی

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں
آنکھ کیا کھولی چمن مرجھا گئے

کون تھے آخر جو منزل کے قریب
آئینے کی چادریں پھیلا گئے

کس تجلّی کا دیا ہم کو فریب
کس دھندلکے میں ہمیں پہنچا گئے

ان کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا
اور جب پلٹے قیامت ڈھا گئے

اِک پہیلی کا ہمیں دیکر جواب
اِک پہیلی بن کے ہر سو چھا گئے

پھر وہی اختر شماری کا نظام
ہم تو اِس تکرار سے اُکتا گئے

رہنماؤ! رات ابھی باقی سہی
آج سیّارے اگر ٹکرا گئے

جن کو ہم سمجھا کئے ابرِ بہار
وہ بگولے کتنے گلشن کھا گئے

کیا رسا نکلی دُعائے اجتہاد
لیجیئے اگلے زمانے آ گئے

آدمی کے ارتقا کا مدعا
وہ چھُپاتے ہی رہے ہم پا گئے

بس وہی معمارِ فردا ہیں ندیم
جن کو میرے ولولے راس آ گئے

اختر الایمان

پندرہ اگست سنہ ۴۷ء

یہی دن ہے جس کے لئے میں نے کاٹی تھیں آنکھوں میں راتیں
یہی سیلِ آبِ بقا، چشمۂ نور ہے، جلوۂ طور ہے وہ!
اسی کے لئے وہ سہانے مدھر، رس بھرے گیت گائے تھے میں نے
یہی ماہ وش نشۂ حسن سے چور، بھرپور، مخمور ہے وہ!

سنا تھا نگاہوں پہ وہ قیدِ آدابِ محفل نہیں اب
وہ پابندیاں دیدہ و دل پہ جو تھیں، اٹھی جا رہی ہیں
وہ مجبوریاں اٹھ گئیں، ولولے راہ پانے لگے مسکرانے لگے اب

محبت کٹھن راستوں سے گزر کر لہکتی مہکتی ہوئی آرہی ہے

وہی کس مپرسی وہی بے حسی آج بھی ہر طرف کیوں ہے طاری
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ میری محنت کا حاصل نہیں ہے
ابھی تو وہی رنگِ محفل، وہی جبر ہے ہر طرف زخم خوردہ ہے انساں
جہاں تم مجھے لے کے آئے ہو یہ وادیٔ رنگ بھی میری منزل نہیں ہے

شہیدوں کا خوں اس حسینہ کے چہرے کا غازہ نہیں ہے
جسے تم اٹھائے لئے جا رہے ہو یہ شب کا جنازہ نہیں ہے

اختر سعید خاں

آزادی

آج پھر ہند کی قسمت کا اُڑانے کو مذاق
مشعلیں لے کے سرِ راہ وہ نکلے قزّاق
رُخ پہ ڈالے ہوئے دستور کی رنگین نقاب
لوٹنے نکلے ہیں مستقبلِ جمہور کے خواب
لفظ کے پھیر معانی کے یہ گورکھ دھندے
ہر قدم راہ میں پھیلائے گئے ہیں پھندے
یوں تو آزادیِ تحریر بھی تقریر بھی ہے
بات جو سچ ہے وہی لائقِ تعزیر بھی ہے

آج بھی ہے وہی فرسودہ و تاریک نظام
آج بھی ہے وہی لٹتا ہوا ناموسِ عوام
زیرِ شمشیر ابھی تک ہیں ہزاروں حلقوم
پھانسیاں آج بھی پاتے ہیں ہزاروں معصوم
چھین کر کتنے مکانوں سے اُجالے کی کرن
چند ایوان چراغوں سے کئے ہیں روشن
دیپ ہاتھوں پہ لئے تیرگی اٹھلاتی ہے
رات کی گود چراغوں سے بھری جاتی ہے

پرچمِ زرد جو ایوانوں پہ لہراتا ہے
زرد ہاتھوں کی طرف دیکھ کے شرماتا ہے

اسرار الحق مجازؔ

جشنِ آزادی

بہ صد غرور - بہ صد فخر و نازِ آزادی
مچل کے کھل گئی زلفِ درازِ آزادی
مہ و نجوم ہیں نغمہ طرازِ آزادی
وطن نے چھیڑا ہے اس طرح سازِ آزادی

زمانہ رقص میں ہے زندگی غزل خواں ہے
ہر اک جبیں پہ ہے اک موجِ نورِ آزادی
ہر ایک آنکھ میں کیف و سرورِ آزادی
غلامی خاک بسر ہے حضورِ آزادی

ہر ایک قصر ہے اک بامِ طورِ آزادی
ہر ایک بام پہ اک پرچمِ زرافشاں ہے
ہر ایک سمت نگارانِ یاسمیں پیکر
نکل پڑے ہیں در و بام سے مہ و اختر
وہ سیلِ نور ہے خیرہ ہے آدمی کی نظر
بصد غرور و ادا خندہ زن ہیں گردوں پر
زمینِ ہند کہ جولاں گہہ غزالاں ہے
صدا دو انجم افلاک رقص فرمائیں
بتانِ کافر و سفاک رقص فرمائیں
شریکِ حلقۂ ادراک رقص فرمائیں
طرب کا وقت ہے بیباک رقص فرمائیں
اب ایسے میں کہ تقاضائے بزمِ رنداں ہے
ہے پاک ابرِ غلامی سے آسمانِ وطن
یہ کام کر گئے آخر بلا کشانِ وطن
ابھی تو خیر سے دہ چند ہوگی شانِ وطن

ابھی تو اور بھی مہکے گا بوستانِ وطن
کہ یہ بہار پیامِ صد بہاراں ہے
یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں
یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں
وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں
ابھی وہ سعیِ جنوں خیز کامیاب نہیں
یہ انتہا نہیں آغاز کارِ مرداں ہے

جاں نثار اختر

آزادی

میں تو یوں خوش تھا کہ آزاد ہوا میرا وطن
میں تو یوں خوش تھا کہ چھوٹا وہ غلامی کا گہن
میں تو یوں خوش تھا کہ اب رات نے کھینچا دامن
میں تو یوں خوش تھا کہ اب صبح ہوئی جلوہ فگن

ڈھل گیا نور کے سانچے میں چمن آج مرا
اپنے گلشن کی بہاروں پہ ہے اب راج مرا

میں تو یوں خوش تھا کہ وہ وقت نہیں ہے اب دُور
جب ہر اِک کاسہ و ساغر سے اُٹھے موجِ سرُور

چہرۂ خاک پہ اُترے گہر و سیم کا نور
رنگِ گل سے ہو شرابور جبینِ مزدور
دیر ہی کیا ہے کلی دل کی کھلی جاتی ہے
خود گلے خواب کے تعبیر ملی جاتی ہے
میں تو یوں خوش تھا کہ چھو لے گی گندھے کی ہیکل
چاندنی خاک پہ ڈالے گی رو پہلا آنچل
موج کے پاؤں میں موتی کی بجے گی پہ چھاگل
لبِ جو نرم ہوا آ کے جلائے گی کنول
جال زرتار شعاعوں کا بُنا تھا میں نے
کتنی ہنستی ہوئی کرنوں کو چُنا تھا میں نے
میں تو یوں خوش تھا کہ اب گونج اٹھیں گے وہ ساز
پھیل جائے گی فضاؤں میں عمل کی آواز
ذرّے ذرّے میں سما جائے گا ذوقِ پرواز
زندگی اپنی اداؤں پہ کرے گی خود ناز

ایک لَے سینۂ عالم میں مچل جائے گی
آج سے وقت کی رفتار بدل جائے گی

نہ سہی آج ہر اِک زلف سنور جائے گی کل
آج رنگت ہے جو پھولوں کی نکھر جائے گی کل
نبضِ خاشاک کی گلشن میں اُبھر جائے گی کل
موج گنگا کی ہمالہ سے گذر جائے گی کل

اپنا ہر رنگ دھنک خاک پہ برسا دے گی
کل زمیں ہند کی خورشید کو شرما دے گی

کیا خبر تھی کہ نظر خود ہے نظاروں کا طلسم
رات کی رات ہے یہ چاند ستاروں کا طلسم
یہ برستے ہوئے موتی ہیں شراروں کا طلسم
یوں خزاں چھُپ کے رچائے گی بہاروں کا طلسم

ٹوٹ جائے گا کوئی دم میں یہ افسونِ بہار
نوکِ ہر خار سے ٹپکے گا ابھی خونِ بہار

ہاتھ لگتے ہی تو رنگِ گلِ تر چھوٹ گیا
ہار گُندھنے بھی نہ پایا تھا ابھی ٹوٹ گیا
جام لب تک بھی نہ آیا تھا ابھی پھوٹ گیا
میرے خوابوں کو نہیں کوئی مجھے لوٹ گیا

میں نے جس نقش میں بھر دی تھی شفق کی تنویر
وقت نے سامنے رکھ دی وہی جلتی تصویر

تُند شعلوں میں یہ لپٹی ہوئی ارضِ پنجاب
ذرّے ذرّے سے اُبلتا ہوا بحرِ خوناب
کروٹیں کرب سے لیتے ہوئے راوی و چناب
غم کے طوفان سے ستلج کے کنارے بیتاب

ظلمتِ مرگ سے چھایا ہوا جہلم پہ ہراس
کِشتیاں آگ کی سینے پہ لیے رودِ بیاس
پھر سے لُٹتا ہوا یہ شاہ جہاں کا گلزار
خون روتی ہوئی یہ "لال قلعے" کی دیوار

یہ ہمیشہ کو اُجڑتا ہوا اُردو بازار
لاکھ جانوں کو سمیٹے یہ ہمایوں کا مزار
کون یہ چھوڑ چلا خطۂ پاکِ دہلی
کس کے قدموں سے لپٹتی ہے یہ خاکِ دہلی

امن سے برہم و برگشتہ یہ تیغوں کا مزاج
رسم و تہذیب کی ہوتی ہوئی قدریں تاراج
ہند کی کہنہ روایات کی لُٹتی ہوئی لاج
خاکِ جمنا پہ یہ بیہوش سا ہوتا ہوا تاج
اِک سیاہی رُخِ خورشید پہ پھرنے کے قریب
چاند خود ٹوٹ کے افلاک سے گرنے کے قریب

گر گئے خاک پہ تھرا کے منارے کتنے
رہ گئے ٹوٹ کے طوفاں میں کنارے کتنے
ہو گئے غرق اندھیرے میں نظارے کتنے
خون میں ڈوب گئے چاند ستارے کتنے

تُند ہوتا ہوا ہر لحظہ لہو کا سیلاب
جیسے شمشیر کی اب پیاس نہ ہوگی سیراب

کیا خبر تھی کہ گرفتارِ فسوں ہونا ہے
صید کو اور ابھی صیدِ زبوں ہونا ہے
اس چمن کو ابھی آلودۂ خوں ہونا ہے
غم کے شعلے کو ابھی اور فزوں ہونا ہے

کیا خبر تھی کہ فقط نام ہے آزادی کا
یہ بھی اِک طرز ہے صیّاد کی صیّادی کا

کیا خبر تھی کوئی تدبیر نہ کام آئے گی
گردشِ وقت لیئے خون کا جام آئے گی
نوُر کی موج نہ ہرگز تہِ دام آئے گی
صبح ہونے بھی نہ پائے گی کہ شام آئے گی

کس کو معلوم تھا یہ زہر بھی پینا ہوگا
سرد پھر ہند کے ماتھے کا پسینا ہوگا

کچھ ہو، امید کی سینے میں جھلک آج بھی ہے
دل میں بجھتے ہوئے شعلے کی لپک آج بھی ہے
پردۂ ابر میں ہلکی سی دھنک آج بھی ہے
پھول کھلنے کی ہواؤں میں مہک آج بھی ہے
اِک ذرا صبر کہ گلرنگ گھٹا چھائے گی
اس گلستاں میں کوئی سُرخ بہار آئے گی

جگرؔ مرادآبادی

غزل

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آجکل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آجکل

انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی
انساں کے سائے سے بھی گریزاں ہے آجکل

دل کی جراحتوں سے کھلے ہیں چمن چمن
اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آجکل

جمہوریت کا نام ہے جمہوریت کہاں
فسطائیت حقیقتِ عُریاں ہے آجکل

کیسا خلوص کیسی محبت۔ کہاں کا درد
خود زندگی متاعِ گریزاں ہے آجکل

جو تھا زبان پر وہ ہوا بن کے اُڑ گیا
جو دل میں تھا حقیقتِ عُریاں ہے آجکل

کانٹے کسی کے حق میں کسی کو گُل و ثمر
کیا خوب اہتمامِ گلستاں ہے آجکل

ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہیں ان دنوں
ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آجکل

کہتے ہیں جس کو صورتِ آزادیٔ وطن
دراصل ایک پیکرِ بے جاں ہے آجکل

کچھ رہبرانِ خاص جو مخلص ہیں واقعی
ان کا چراغ بھی تہہِ داماں ہے آجکل

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگر
جو مصلحت کہ پیشۂ مرداں ہے آجکل

جگن ناتھ آزاد

طوفان کے بعد

رات کے پردے میں ہو جاتا ہے سامانِ سحر
رات کے پردے میں سامانِ سحر ہو نہ سکا
ختم گو ہو بھی چکا عالمِ ظلمات کا دَور
صبح کا تارا نمودار مگر ہو نہ سکا

جا چکی رات اُفقِ شرق پہ پَو پھٹ نہ سکی
تیرہ و تار فضاؤں کی سیاہی نہ گئی
ایک افسانہ ہوا اگرچہ خزاں کا عالم

صحنِ گلشن سے بگولوں کی تباہی نہ گئی

دیدۂ شوق نے یہ سمجھا کہ طوفان گئے
زندگی ایک سکوں پائے گی ہیجان کے بعد
لیکن اے آرزوئے دید! ذرا غور سے دیکھ
کتنے طوفان نمودار ہیں طوفان کے بعد

اپنے ماحول سے بیگانہ رہا جوشِ جنوں
عقل منزل کی طرف جا کے پلٹتی ہی رہی
سانس آزاد فضاؤں میں کبھی لے نہ سکی
زندگی موت کے دامن میں سمٹتی ہی رہی

حیف صد حیف کہ انسان کا یہ فکرِ منیر
تند طوفاں پہ ذرا سا بھی اثر کر نہ سکا
وہ جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا

زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا،،

ہم نے مانا کہ ہے طوفان کا مفہوم یہی
زندگی کی شبِ تاریک سحر ہو نہ سکے
اپنی منزل تو نظر آئے خرد کو لیکن
اپنی منزل کی طرف اُس کا گزر ہو نہ سکے

باوجود اس کے ارادوں کا تقاضا ہی یہی
لڑکھڑاتی ہوئی دُنیا کو سنبھلنا ہے ضرور
تیز طوفان فضاؤں میں مچلتے ہی رہیں
میری بُجھتی ہوئی قندیل کو جلنا ہے ضرور

جوشؔ ملیح آبادی

نوبہار

یہ بیونت اور یہ کتر۔ یہ کانٹ چھانٹ ابتری
شناوروں کی ڈبکیاں، مجاہدوں کی بے پری
یہ کوہکن کی کپکپی، یہ پیرزن کی تھرتھری
لباسِ برزل وجود میں چھپی ہوئی ہے قیصری
شگفتہ برگ ہائے گل کی تہہ میں نوکِ خار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے
یہ مقبلوں کی دشمنی۔ یہ مفلسوں کی جانکنی
یہ امن سوز شیخیت۔ یہ کیف ور برہمنی

بدی۔ بُرائی۔ بے رُخی۔ بگاڑ۔ بحث۔ بدظنی
کشیدگی۔ رمیدگی۔ غلو۔ بغض۔ دُشمنی
غضب کا خلفشار ہے۔ بلا کی گیر و دار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

قتال و خون و جنگ ہے، جنون جبر و قہر ہے
گرج ہے بات بات میں فساد شہر شہر ہے
فضا میں رقص مرگ ہے، زمیں پہ موج زہر ہے
سیاہیوں کا زور ہے تباہیوں کی لہر ہے
کماں میں تیر حرب ہے کمیں میں شہریار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

یہ لُٹیں۔ یہ رشوتیں یہ پگڑیاں یہ چوریاں
یہ شرمناک چوریاں اور اس پہ سینہ زوریاں
سُبک گراں فروشیاں۔ ذلیل نفع خوریاں
اِدھر خلا ہے بھوک کا، اُدھر بھری ہیں بوریاں
نہ پیٹ میں نوالہ ہے نہ تن پہ ایک تار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

ساحر لدھیانوی

مفاہمت

نشیبِ ارض میں ذرّوں کو مشتعل پا کر
بلندیوں پہ سفید اور سیاہ مل ہی گئے
جو یادگار تھے باہم ستیزہ کاری کے
بہ فیضِ وقت وہ دامن کے چاک سِل ہی گئے

جہاد ختم ہوا دَورِ آشتی آیا
سنبھل کے بیٹھ گئے محملوں میں دیوانے
ہجومِ تشنہ لباں کی نگاہ سے اوجھل

چھلک رہے ہیں شرابِ ہوس کے پیمانے

یہ جشن، جشنِ مسرّت نہیں، تماشا ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس
ہزار شمعِ اخوت بجھا کے نکلے ہیں
یہ تیرگی کے اُبھارے ہوئے حسیں فانوس

یہ شاخِ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائیگی
نہ پھل سکی تو نئی فصلِ گل کے آنے تک
ضمیرِ ارض میں اِک زہر چھوڑ جائے گی

سردار جعفری

فریب

۱۵ ر اگست اور اسکے بعد

ناگہاں شور ہوا
لو شبِ تارِ غلامی کی سحر آپہونچی
انگلیاں جاگ اُٹھیں
بربط و طاؤس نے انگڑائی لی
اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں
کھِل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول
لوگ چلائے کہ فریاد کے دن بیت گئے
راہزن ہار گئے

راہرو جیت گئے

قافلے دور تھے منزل سے، بہت دور، مگر
خود فریبی کی گھنی چھاؤں میں دم لینے لگے
چن لیا راہ کے روڑوں کو خذف ریزوں کو
اور سمجھ بیٹھے کہ بس لعل و جواہر ہیں یہی
راہزن ہنسنے لگے چھپ کے کمیں گاہوں میں

ہمنشیں یہ تھا فرنگی کی فراست کا طلسم
رہبرِ قوم کی ناکارہ قیادت کا فریب
ہم نے آزردگیِ شوق کو منزل جانا
اپنی ہی گردِ سرِ راہ کو محمل جانا
گردشِ حلقۂ گرداب کو ساحل جانا

اب جدھر دیکھو اُدھر موت ہی منڈلاتی ہے

درودیوار سے رونے کی صدا آتی ہے
خواب زخمی ہیں، اُمنگوں کے کلیجے چھلنی
میرے دامن میں ہیں زخموں کے دہکتے ہوئے پھول
خون میں لتھڑے ہوئے پھول
میں جنھیں کوچہ و بازار سے چن لایا ہوں
قوم کے راہبرو، راہزنو
اپنے ایوانِ حکومت میں سجالو ان کو
اپنے گلدانِ سیاست میں لگالو ان کو

اپنی صد سالہ تمناؤں کا حاصل ہے یہی
موجِ پایاب کا ساحل ہے یہی
تم نے فردوس کے بدلے میں جہنّم لے کر
کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے
چند سکّوں کے عوض چند ملوں کی خاطر
تم نے ناموسِ شہیدانِ وطن بیچ دیا

باغباں بن کے اُٹھے اور چمن بیچ دیا

۲

کون آزاد ہوا ؟
کس کے ماتھے سے سیاہی چھوٹی
میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا
مادرِ ہند کے چہرے پہ اُداسی ہے وہی

خنجر آزاد ہیں سینوں میں اُترنے کیلئے
موت آزاد ہے لاشوں پہ گذرنے کیلئے

چور بازاروں میں بدشکل چڑیلوں کی طرح
قیمتیں کالی دوکانوں پہ کھڑی رہتی ہیں
ہر خریدار کی جیبوں کو کترنے کیلئے

کارخانوں پہ لگا رہتا ہے
سانس لیتی ہوئی لاشوں کا ہجوم
بیچ میں اُن کے پھرا کرتی ہے بیکاری بھی
اپنا خونخوار دہن کھولے ہوئے

اور سونے کے چمکتے سکّے
ڈنک اُٹھائے ہوئے پھن پھیلائے
رُوح اور دل پہ چلا کرتے ہیں
مُلک اور قوم کو دن رات ڈسا کرتے ہیں

روٹیاں چکلوں کی قحبائیں ہیں
جن کو سرمایہ کے دلّالوں نے
نفع خوری کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے

بالیاں دھان کی گیہوں کے سنہرے خوشے

مصر و یونان کے مجبور غلاموں کی طرح
اجنبی دیس کے بازاروں میں بِک جاتے ہیں
اور بدبخت کسانوں کی بلکتی ہوئی رُوح
اپنے افلاس میں مُنہ ڈھانپ کے سو جاتی ہے

ہم کہاں جائیں، کہیں کس سے کہ نادار ہیں ہم
کس کو سمجھائیں غلامی کے گنہگار ہیں ہم
طوق خود ہم نے پہنا رکھا ہے ارمانوں کو
اپنے سینے میں جکڑ رکھا ہے طوفانوں کو

اب بھی زندانِ غلامی سے نکل سکتے ہیں
اپنی تقدیر کو ہم آپ بدل سکتے ہیں

۳

آج پھر ہوتی ہیں زخموں سے زبانیں پیدا

تیرہ و تار فضاؤں سے برستا ہے لہو
راہ کی گرد کے نیچے سے اُبھرتے ہیں قدم

تارے آکاش پہ کمزور حبابوں کی طرح
شب کے سیلاب سیاہی میں بہے جاتے ہیں
پھوٹنے والی ہے مزدور کے ماتھے سے کرن
سُرخ پرچم اُفقِ صبح پہ لہراتے ہیں

ضیاؔ جالندھری

یہ بہار!

سرکتے پتّوں کے آخری گیت برف کی تہ میں ڈوب چکے تھے
ہوا کی موجوں پہ بہتے آئے تھے برف کے نرم نرم گالے
گھنے سیہ بادلوں سے خاموش لڑکھڑاتے، پھسلتے، گرتے
خزاں زدہ وادیوں، چٹانوں کو اپنے دامن میں لے چکے تھے
غبارِ برف اِک دبیز پردے کی طرح پربت پہ چھا چکا تھا
یہاں شگوفے نہیں تھے، کوئی کرشمۂ رنگ و بو نہیں تھا
کرشمۂ رنگ و بو تو کیا برگِ خشک نایاب ہو گیا تھا
کہ برف شاخوں پہ شمع کے آنسوؤں کی مانند جم چکی تھی

کبھی کبھی پھر بھی دل میں امید کی کرن جیسے جگمگاتی
خزاں، زمستاں، بہار کا آہنی تسلسل یقیں دلاتا
کہ ایک دن یہ جمود ٹوٹے گا، آسماں پھر نکھر سکے گا
میں جانتا تھا کہ حدّتِ شوق سے یہ برف اب پگھل سکے گی
جمود ٹوٹا مگر فلک پر تبسّمِ نیلگوں نہیں ہے،
پگھل کے بہہ بھی گئیں تہیں برف کی مگر فصلِ گل کہاں ہے
کہاں ہیں وہ پھول، وہ شگوفے، وہ کونپلیں، وہ لہکتا سبزہ
نہیں نہیں، یہ تو اک فریبِ نظر ہے یہ فصلِ گل نہیں ہے
بہار کیسی یہاں تو اک جوئے آتشیں ہر طرف رواں ہے
بہار کیسی کہ کوہِ آتش فشاں نے لاوا اُگل دیا ہے

ظہیر کاشمیری

غزل

ہم اپنی تخریب کر رہے ہیں، ہماری وحشت کا کیا ٹھکانہ
فضا میں بجلی نہ ہو تو خود ہی اُجاڑ دیتے ہیں آشیانہ

غمِ محبت تلاش کرنے چلے تھے لیکن یہ کیفیت ہے
جُھکی جُھکی مضمحل نظر سے جھلک رہا ہے غمِ زمانہ

سحر ہو یا آمدِ سحر ہو، مری خلش مٹ سکے تو جانوں
مرے لبوں پر لرز رہا ہے ابھی وہی نالۂ شبانہ

اگرچہ حسنِ قدیم اپنے پرانے تیور بدل چکا ہے،
مگر وہی دل گرفتگی ہے، مگر وہی عشق کا فسانہ

خبر نہ تھی صحنِ گلستاں میں یہ حال ہوگا کلی کلی کا
گلوں نے گلچیں سے بھول کر بات کی باندازِ محرمانہ
اگرچہ ذوقِ تلاش ہر ایک راستے سے گزر چکا ہے
مگر ابھی تک جبینِ سجدہ سے دُور ہے سنگِ آستانہ

عبدالمتین عارف

۱۵ر اگست

—— سحر کی حسینہ چلی آ رہی ہے !
گلو مسکراؤ —— چٹکتی ہوئی کونپلوں گنگناؤ !
پھسلتے ہوئے آبشارو، ذرا اپنے نغموں کی آتش کو تنکے دکھاؤ
سکوں یافتہ جھیلو، پھیلا دو اپنے کنول سطحِ شفاف پر ایک پل میں
حسیں سبزہ زارو، یہ شبنم کے موتی ابھی اور تابندگی چاہتے ہیں
اٹھو موجو ساحل کی تشنہ لبی اپنے بوسوں کی تازہ دمی سے بجھا دو
وہ دیکھو —— وہ دیکھو، سحر کی حسینہ چلی آ رہی ہے !

تمھیں کیا کہ لاکھوں ستاروں کی مرگِ جواں نے سحر کی حسینہ کو بخشی ہے یہ زندگانی؟
سحر کی حسینہ ہے آلودۂ خوں — تمھیں اس سے مطلب؟
سحر کی حسینہ کے سینے میں پیوست ہیں تین خنجر — تمھیں اس کا غم کیا؟
تمھیں تھی سحر کی حسینہ کی حسرت — سو وہ آگئی ہے!

غلام ربّانی تاباںؔ

۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ء

مغربی شیطنت کے چہرہ پر
دیکھ اپنے لہو کا غازہ ہے
تین صدیاں گذر چکیں لیکن
زخم سینہ کا اب بھی تازہ ہے

کس سے شکوہ کریں ہم اپنوں کا
گرتے گرتے سنبھل گیا دشمن
دے کے ہمکو فریبِ آزادی
اک نئی چال چل گیا دشمن

جسم پہلے سے قید تھا لیکن
رُوح پر اُس نے دام پھینکدیا
آچکا تھا جو تشنہ ہونٹوں تک
ہم نے خود ہی وہ جام پھینکدیا

رات کی واژگوں فصیلوں کے
اُس طرف منتظر سویرا تھا
"دولتِ مشترک" کے شیدائی
اپنی قسمت ہی میں اندھیرا تھا

اپنے پاؤں میں بیڑیوں کے عوض
پڑ رہی ہیں طلائی زنجیریں
تابناک و حسین خوابوں کی
رُوح فرسا ہیں کتنی تعبیریں

فکرؔ تونسوی

آزادی کی پُوجا

راج مندر میں مُسلسل بج رہی ہیں گھنٹیاں ــــ
اور بُلاوے پر بُلاوے دے رہے ہیں ــــ "آؤ، آؤ!"
"اپنے ذوقِ سجدہ ریزی کو ذرا تسکین دو،
اِک بُتِ نَو کو تمھاری بندگی کا امتحاں مقصود ہے
تم ــ کہ صدیوں تک رہے ہیں بند جن پر یہ سُنہرے بام و در
تم ــ کہ زنجیروں میں، آہوں میں رہے اب تک اسیر
آج سے آزاد ہو۔
آج یہ زرتار چوکھٹ اور طلائی دائرے تم کو نہ روکیں گے کبھی

— آؤ، آؤ! پھول چن لاؤ، اگر بتی جلاؤ!
تھالیاں کانسی کی چھنکاؤ، جلاؤ پریم کے خوں سے چراغ
آرتی کی دھن میں گاؤ —— گاؤ، گاؤ، جھوم جاؤ
ناچ اٹھو، ماتھا رگڑو، سر جھکاؤ!
اور بھگتی کے سریلے، مدھ بھرے سنگیت رس میں ڈوب جاؤ! ——"

۲

میں —— کہ تھا صدیوں سے زنجیروں میں، اوہموں میں اسیر
اور اس آزاد لمحے کے تصور سے تڑپ جاتا تھا میں
آج کیوں اٹھتے نہیں میرے قدم
آج میری روح میں کیوں تھرتھری مچتی نہیں
آج کیوں ان گھنٹیوں کی لے پہ میری کان کی بنسری بجتی نہیں
میری پیشانی میں کیوں وہ سجدۂ سیماب آسا سو گیا؟
آہ! یہ میری نظر کے سامنے کیسے اندھیرے سے امڈ کر آ گئے؟
آہ! مجھ کو تھام لو،
لاؤ، لاؤ —— وہ مرے پھولوں کے گجرے کیا ہوئے؟

وہ مری کانسی کی تھالی، وہ اگربتی مری ؟
وہ کہاں رکھا ہے میرے پریم کے رس کا چراغ ؟
آرتی کے بول مجھکو یاد تھے ـــــ وہ کیا ہوئے ؟
میں بھلا کیا لے کے جاؤں دیوتا کے سامنے ؟
میں تہی دامن، فسُردہ دل، اندھیرے کا شکار ؟
پاؤں پتھر، ہونٹ گونگے، آنکھ نم ؟
میں بھلا کیا لے کے جاؤں دیوتا کے سامنے ؟
آہ میں مجبُور ہوں،
آہ میں مجبُور ہوں، اے راج مندر کی مسلسل گھنٹیو!
بند کر دو اپنے یہ پیہم بُلاوے ـــــ میں بہت مجبُور ہوں
میں بہت مجبُور ہوں ـــــ!

فیض احمد فیض

سحر

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مِل جائیگی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل

جواں لہو کی پُراسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں، بدن بُلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سُبک سُبک تھی تمنّا، دبی دبی تھی تھکن
سُنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
سُنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام

جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا، کدھر کو گئی

ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

قتیل شفائی

بہلاوے

یہی کفن اوڑھ لو بدن پر سمور و سنجاب کو بھلا دو
بجھے چراغوں سے روشنی پاؤ مہر و مہتاب کو بھلا دو
جو تم نے مانگا ہے مل گیا ہے ہر اک نئے خواب کو بھلا دو
اسی لحد میں جیو مرو گے لحد سے آگے محل نہیں ہے

یہ رہنماؤں کی تیز گامی جو ہاتھ مل مل کے رو رہی ہے
یہ رہگذاروں کی دلفریبی جو خون کے بیج بو رہی ہے
یہ اپنی منزل جو منہ لبسورے ہوا کے دامن میں سو رہی ہے
تمھیں بتاؤ ضمیرِ انساں انھیں سہاروں پہ جی رہا ہے

یہ زرد چہروں پہ ہانپتے کانپتے اُفق پار کے فسانے
یہ سرد آہوں میں کسمساتے ہوئے ندامت کے تازیانے
یہ گرم پیشانیوں کی آنچیں یہ نرم زلفوں کے شامیانے
اُفق کے اُس پار جاتے جاتے اِک اور منزل پہ آگئے ہیں

ہزار وعدے بھی ہوں تو لیا ہی بھلا کوئی یوں بہل سکا ہے
خلاؤں میں تیر مارنے سے کہیں بُرا وقت ٹل سکا ہے
نگاہ کی خود فریبیوں سے کبھی زمانہ بدل سکا ہے
اُفق کے اُس پار جانے والو! مرے تجسس کے ہم خیالو

کمال احمد صدیقی

فریبِ آزادی

وہ کرن پھوٹی، کھُلا پرچمِ خورشید سحر
کِس نے مانی ہی سیہ مستیِ میخوار کی بات
رقص کرتی ہے زمیں، ناچتے ہیں ماہ و نجوم
اک حکایت ہی فقط ساغرِ سرشار کی بات

جام کو توڑ کے بدمست کیا کرتا ہے
وہی جذبہ جو کبھی رقص کناں رکھتا ہے!
یہ حسیناؤں کے سینے، یہ جواں سال اجسام

خون ہی خون ہے جو اُنکو جواں رکھتا ہے

آج ساقی نے کوئی زہر ملایا ہوگا۔
ورنہ میخواروں نے کیوں توڑ دیئے پیمانے؟
عصمتِ حسن لُٹی مالِ غنیمت کیطرح۔
خون و شمشیر سے تحریر ہوئے افسانے!

قلبِ تاریکی پہ بنیادِ سحر رکھی گئی۔
اور مسرت کیلئے ایک بھی عنوان نہ رہا!
رنگ لہرائے گئے چاندنی برسائی گئی۔
اپنے ہاتھوں میں جب اپنا بھی گریبان نہ رہا

بے حسی ہے کہ یہ محرومی کہ ناکامی ہے
کوئی مضراب نہیں سازِ تخیل کیلئے
کتنی پُر پیچ ہے اُلجھی ہوئی شہ راہِ حیات

فکر ہوگی کیسے آرائشِ کاکُل کیلئے؟

اتنی رنگیں ہی فضا اور یہ حالت اپنی ــــ
اشک آنکھو نمیں نہیں لب پہ تقاضا بھی نہیں!
وہ بھی دن تھے کہ گوارا تھی اجل زیست کے نام
اب یہ عالم ہی کہ سر میں کوئی سودا بھی نہیں!

یہ سحر میری تمناؤں کا حاصل تو نہیں،
اسکو منزل نہ کہو، یہ مری منزل تو نہیں!

آج بھی ہی وہی گلشن میں خزاؤں کا دھواں
کون کہتا ہی بہاروں کی ہی آمد آمد؟
آج بھی راہ میں حائل ہیں وہی کوہ گراں
سنگِ مرمر نہ سہی، آج ہی سنگِ اسود

آج بھی حاکم و محکوم کے رشتے ہیں وہی
صرف ناموں کے بدلجانے سے کیا ہوتا ہے؟
آج بھی ہے وہی زہرابہ، وہی اسکا اثر
صرف جاموں کے بدلجانے سے کیا ہوتا ہے؟

یہ تو صیاد کی اک چال ہے اور کچھ بھی نہیں
چاہتا ہے کہ قفس ہی کو نشیمن سمجھیں
پہرے داروں ہی کی تبدیلی ہوئی ہے ورنہ
آج بھی دیکھ رہی ہیں وہی منظر آنکھیں

ہم ہیں آزاد نہ مانے گا مرا ذوقِ سلیم
زندگی جکڑی ہوئی، جال سنہرے ہیں وہی

آج بھی زر کی وہی غیر مساوی تقسیم
آج بھی قوتِ تخلیق پہ پہرے ہیں وہی

آج بھی ہے وہی صدیوں کی پُرانی تنظیم
وہی زنداں کی سلاخیں ہیں، کٹہرے ہیں وہی

انقلاب آ ہی گیا ہے، جھوٹ ہے، یہ دھوکا ہے
انقلاب آئیگا، آئیگا، ضرور آئے گا
یہ نئی صُبح نہیں، رات ابھی باقی ہے —
آفتاب آئیگا، آئیگا، ضرور آئے گا

آؤ اِک جام مئے سُرخ بنامِ فردا —
وہی فردا، کہ نہ ہوں جسمیں زر و سیم کے جال
جسمیں دہقان کے کھلیان پہ ڈاکے نہ پڑیں
جسمیں مزدور کی محنت کا نہ ہو استحصال

زندگی اب بھی مقید ہے چند ایوانوں میں
آج بھی لڑنا ہے ہم کو انھیں میدانوں میں !!

کیفی اعظمی

مصالحت

کبھی جیسے مُنھ پہ مَل کے نکلے کبھی جیسے خوب خوب اُچھالا
وہ خوں شہیدوں کا آخرِ کار رہنماؤں نے بیچ ڈالا
منا چکے جشن کامرانی تو یہ حقیقت ہوئی نمایاں
فریب دے کر نجات کا لے لیا غلامی نے اِک سنبھالا
اسے گدائی کہوں کہ شاہی نہ یہ گدائی ہے اور نہ شاہی
جبیں پہ کانٹوں کا تاج دستِ طلب میں سونے کا ہے پیالا
ہزار سکوں میں تھی رقابت مگر بڑھایا جو ہاتھ ہم نے
سب اِک تجوری میں جا چھپے ان میں کوئی گورا رہا نہ کالا

سحر کا مژدہ سُنانے والو، طلوع بے شک سحر ہوئی ہے
مگر وہ کس کام کی سحر جو چُرا لے کُٹیاؤں کا اُجالا

مصالحت کے سکوت میں ہم ہے بغاوت کے ڈھل چکے ہیں
بدلنے اُٹھے تھے جو مقدر وہ رہنما خود بدل چکے ہیں
کہاں مفاداتِ حکمرانی، کہاں تقاضائے رہنمائی
بڑھیں گے ٹھکرا کے رہبروں کو وہ قافلے اب جو چل چکے ہیں
خود اپنے چکر میں پھنس گیا ہے نظام سکّے کی گردشوں کا
خود اپنی حدّت سے طوقِ زر کے تمام حلقے پگھل چکے ہیں
دوہائی حُبِّ وطن کی دے کر انھیں کچلنا ہے غیر ممکن
یہ قحط و افلاس کے بھنور جو حکومتوں کو نگل چکے ہیں
ہٹے نہ پیچھے نشاں دلیرو کہ اب محافظ ہو تم نشاں کے
رُکے نہ پائے طلب جوانو کہ سارے کانٹے نکل چکے ہیں

مخمورؔ جالندھری

زنجیر ٹوٹتی ہے

ہم آنسو ہیں جلتے ہوئے خون کے سُرخ موتی
ٹپکتے رہے ہیں ٹپکتے رہیں گے
یہ آنسو ہیں ___ ہم چیتھڑے ہیں قبائے دریدہ کے لاکھوں پرخچے
ادھڑتے رہے ہیں ادھڑتے رہیں گے
یہ آنسو ہیں، یہ چیتھڑے ___ اور ہم زخم ہیں زندگی کے بدن پر
تپکتے رہے ہیں تپکتے رہیں گے
ہمارا یقین! برستے رہیں گے، ادھڑتے رہیں گے، تپکتے رہیں گے
ہمیں تم نے کیوں ڈگمگایا

ہمیں تم نے چھیڑا، ہمیں تم نے نوچا، ہمیں تم نے چھیلا
ہم اپنے قناعت کے گوشوں میں بے سُدھ پڑے تھے
ہم آنسو سے پرچی تو ہلکا کیے جا رہے تھے
یہ آنسو تھے ہم چیتھڑے تھے برہنہ تنی اپنی جوں توں ڈھکے جا رہے تھے
یہ آنسو تھے یہ چیتھڑے اور ہم زخم تھے گرتے پڑتے بجے جا رہے تھے

ہمیں ــــــ تم نے چھیڑا
کہ زنجیر ٹوٹی تو کانٹوں کی کلیاں نہیں گی بکھر جائیں گی راستوں پر
نقاہت کے مارے ہوئے بانجھ کھیتوں میں دانے نہیں اب زمرد اُگیں گے
انڈیلیں گے خانہ بر اندازِ گلشن چمن کے چمن جھولیوں میں
اُتارے ہوئے ماتمی جوڑ راتیں عروسی لبادے میں آیا کریں گی
یہ ارمان سینے میں گھونپے ہوئے تیز خنجر نہ ہوں گے
تمنائیں روزے نہ رکھیں گی اسکے بجائے فراوانیٔ سیر چشمی کا شکوہ کریں گی
نہ ہو گی کھنکتی ہوئی جیب بھی مول دوشیزگی کا
جو تلوار اٹھی تو اُٹھے گی حفظِ حمیت کی خاطر

ہمیں تم نے نوچا

تپک بھی وہی ہے، کسک بھی وہی ہے، جلن بڑھ گئی ہے

پکائی تھی جو کاٹھ کی ہنڈیا تم نے کئی مرتبہ چڑھ گئی ہے

ہمارا بہت اعتبار آزمایا گیا ہے

بہک تو گئے ہیں فریب غلط کار کھا تو گئے ہیں

یہاں تک پہونچ کر مگر لوٹ جائیں یہ مردانگی تو نہیں ہے

تمہارے لئے جو نبرد آزما ہو گئے تھے وہ اپنے لئے کیا نہیں کر سکیں گے

ابھی تم نے یہ بھید پایا نہیں ہے

کہ ہم نے تمہیں دوسرا رُوپ اپنا ابھی تک دکھایا نہیں ہے

ہم آنسو ہیں ـــــ جلتے ہوئے تیل کے چھینٹے بن کر اُڑیں گے

یہ آنسو ہیں، ہم جلتے چھٹرے ہیں ابھی تازیانوں میں تبدیل ہو کر برسنے لگیں گے

یہ آنسو ہیں، یہ جلتے چھٹرے ـــــ اور ہم زخم ہیں رِس پڑیں گے ہلاکت کے دھارے بنیں گے

کہ لوہے سے کٹتا ہے لوہا ـــــ

مسعود حسین

یومِ آزادی

میں نے آزادی کے دن دیکھا تھا
ایک سیلابِ نشاط!
بگھیاں، گھوڑے، اِک انبوہِ کثیر
کاریں پھولوں سے ڈھکی
اور بیکاروں کے سینوں پہ اُچھلتے ہوئے ہار
آگئی جیسے بہار!
قوم کے تازہ نہال
ہند ماتا کے سپوت، اس کے لال

اریہ ورش کے بیدار خیال
جن کا دل تنگ تھا اور جسم نڈھال
جام میں اپنے لئے شبنم تھے!
ذرّے زیادہ تھے ستارے کم تھے!

بیبیاں چند اُداس
جن کی آنکھوں میں نہ نشّہ نہ غرور
لذّتِ شوقِ غلامی سے جواب تک تھیں چور
سرکشی جن کے نہ سینے میں، نہ دل میں بھرپور
یومِ آزادی نے بخشا نہ جنہیں جذب و سرور
لالہ و گل کا یہ پژمُردہ ہجوم
دیکھ کر اور بھی دل تھا مغموم
خاکِ رہ آج بھی بیدار نہ ہونے پائی!
ایسی آزادی کا آیا نہ سمجھ میں مفہوم

کیسا سیلابِ نشاط!

ایک بھی موج تھی تیز؟
مل کے چلتے تھے مگر پھر بھی تھے سب کم آمیز!

میں نے آزادی کے دن دیکھا تھا
بلبلے چند نمودار ہوئے
سطح پر رقص کیا،
پھوٹ گئے!
اور دریا کو خبر تک نہ ہوئی!!

معین احسن جذبی

نیا سورج

بڑے ناز سے آج اُبھرا ہے سورج
ہمالہ کے اونچے کلس جگمگائے
پہاڑوں کے چشموں کو سونا بنایا
نئے بل، نئے زیر و بم ان کو سکھائے
لباسِ زری آبشاروں نے پایا
نشیبی زمینوں پہ چھینٹے اُڑائے
گھنے اونچے اونچے درختوں کا منظر
یہ ہیں آج سب آبِ زر میں نہائے

مگر ان درختوں کے سائے میں اے دل
ہزاروں برس کے یہ ٹھٹھرے سے پودے
ہزاروں برس کے یہ سمٹے سے پودے
یہ ہیں آج بھی سرد بے حال بیدم
یہ ہیں آج بھی اپنے سر کو جھکائے
ارے او نئی شان کے میرے سورج
تری آب میں اور بھی تاب آئے
ترے پاس ایسی بھی کوئی کرن ہے
جو ایسے درختوں میں بھی راہ پائے
جو ٹھٹھرے ہوؤں کو جو سمٹے ہوؤں کو
حرارت بھی بخشے گلے بھی لگائے

بڑے ناز سے آج اُبھرا ہے سورج!
ہمالہ کے اونچے کلس جگمگائے
فضاؤں میں ہونے لگی بارشِ زر

کوئی نازنیں جیسے افشاں چھڑائے
دمکنے لگے یوں خلاؤں کے ذرّے
کہ تاروں کی دُنیا کو بھی رشک آئے
ہمارے عقابوں نے انگڑائیاں لیں
سنہری ہواؤں میں پر پھڑپھڑائے
فزوں تر ہوا نشۂ کامرانی
تجسّس کی آنکھوں میں ڈورے سے آئے
قدم چومنے برق و باد آب و آتش
بصد شوق دوڑے بصد عجز آئے
مگر برق و آتش کے سائے میں اے دل
یہ صدیوں کے خود رفتہ ناشاد طائر
یہ صدیوں کے پر بستہ برباد طائر
یہ ہیں آج بھی مضمحل دل گرفتہ
یہ ہیں آج بھی اپنے سر کو چھپائے

ارے اونچی شان کے میرے سورج
تری اب میں اور بھی تاب آئے
ترے پاس ایسی بھی کوئی کرن ہے
انھیں پنجۂ تیز سے جو بچائے
انھیں جو نئے بال و پر آ کے بخشے
انھیں جو نئے سر سے اُڑنا سکھائے

نریش کمار شاد

انحراف

اُفق سے تا اُفق ہیں زہر سے بھری سیاہیاں
نظر نظر، لہو لہو، نفس نفس، دُھواں دُھواں
فغاں کہ لُٹ گیا ہے اپنی آرزو کا کارواں

کوئی بھی راہبر نہیں کوئی بھی پیش رو نہیں
فروغِ تیرگی ہے یہ طلوعِ صبحِ نَو نہیں

بہار آگئی مگر فضائیں پُر ملال ہیں

کلی کلی ہے سوگوار پھول پائمال ہیں
خزاں نصیب زندگی کے ولولے نڈھال ہیں

دل و نگاہ میں ابھی طرب کی کوئی ضَو نہیں
فروغِ تیرگی ہے یہ طلوعِ صبحِ نو نہیں

بچھا ہوا ہے چار سو نظامِ زر کا دام ابھی
اسیر ہیں خیال و فکر ذہن ہیں غلام ابھی
رُکو نہ میرے ساتھیو کہ دور ہے قیام ابھی

رُکو نہ میرے ساتھیو یہ ضو سحر کی ضو نہیں
فروغِ تیرگی ہے یہ طلوعِ صبحِ نو نہیں

نیاز حیدر

تشنگی

یہ چھلکتا ہوا جام
میں اسے پی نہ سکوں گا ساقی
آزمائی ہوئی شے
ذائقہ تلخ نشہ پھیکا ہے
چند لمحوں کا سرور
جیسے اِک ماہ جبیں دوشیزہ
مسکراتی ہوئی تیزی سے گزر جاتی ہے
چند لمحوں کا سرور

تشنگی ساغرِ مے سے بھی کہیں جاتی ہے
توڑ دے جام و سبو
تشنگی نام ہے جینے کا مجھے جینے دے
تشنگی روزِ ازل سے ہے رفیقِ دل و جاں
تشنگی وجہ طلب۔ ذوقِ طلب۔ حسنِ طلب
تشنگی پر ہے زمانہ کا مدار
راتیں — جو آنکھوں ہی آنکھوں میں بسر ہوتی ہیں
راتیں — جو پچھلے پہر اشکوں سے تر ہوتی ہیں
صبح ہوتی ہے تو پی جاتا ہے سورج ان کو
رات ڈھل جاتی ہے شبنم کے حسیں قطروں میں
صبح دم — پھولوں کے لاکھوں ساغر
منتظر ہوتے ہیں سورج کیلئے
یہ صبوحی کہ جسے پی کے دمک اٹھتا ہے
روئے خورشید جہاں تاب — شعاعیں جس کی

ناگنیں بن کے ہر اک بوند کو پی جاتی ہیں
بوند ــــ آنسو کی ہو یا شبنم کی
کرۂ ارض پہ باقی نہیں رہنے پاتی
خشک ہو جاتے ہیں سب
گلِ تر
دیدۂ تر
کوئی خورشید کی سفّاک تپش پی جائے
رات کے چاند کا عالم دیکھو
چاند اک گھونٹ میں پی جاتا ہے سورج کی تپش
شبنم و اشک دُعا کرتے ہیں
کہ زمانہ میں سحر ہو نہ کبھی
اور یہ سلسلۂ تشنہ لبی
اے خدا دہر میں جاری ہے نہ جانے کب سے
کیسے مانوں لبِ لعلیں کے ہزاروں بوسے

رُوح کی پیاس بُجھا سکتے ہیں
عشق سیراب نہیں ہو سکتا
یہ چھلکتا ہوا جام
میں اسے پی نہ سکوں گا ساقی

وامق جونپوری

نئی کروٹ

زندگی نے نئی کروٹ بدلی
اُفقِ دل پہ شفق لہرائی
تلخیٔ شب سے ڑندھے چہروں پر
سُرخیٔ نورِ سحر بَل کھائی

دیکھ کر سینۂ گیتی پامال
آ گیا خاک کے ذرّوں کو جلال

لاؤ دکھلاؤ کہاں ہے وہ لہو
جس کے جورہ گیا تھا پلکوں پر
لیلیِ وقت کی آغوش ہے وا
اپنے غم خانوں سے نکلو باہر

ختم آگئیں وہی زہریلے ہونٹ
لے کے امرت سوئے بیمار آئے
ایک ہو جانے کو دو ہات اُٹھے
کب کے بچھڑے ہوئے غمخوار آئے
درِ زنداں کے چٹخنے لگے قفل
کیوں سلاسل کے دہن ہیں ویراں
ابنِ آدم کے پسینوں کے تلے
دب گیا آگ کا سیلاب گراں
بنتِ حوّا کی سلگتی ہوئی آہ
کر گئی آہنی پنجوں کو دھواں

خوں میں ڈوبی ہوئی سنگینوں کو
کھا گئی رینگتے بچّوں کی فغاں
توڑ کر آہنی دیواروں کو
بڑھ گیا آگے بہت عزمِ جواں
اِک یہودی کے قلم کی تحریر
جس کو ہر ہاتھ مٹاتا ہی رہا
ایک مجذوب کی زرّیں تقریر
جس کو ہر ذہن بھلاتا ہی رہا
کیسی تحریر تھی کیسی تقریر!
خواب خود بن گیا اپنی تعبیر!!
زندگی نے نئی کروٹ بدلی
اُفقِ دل پہ شفق لہرائی

فسادات

احمد ندیم قاسمی

آزادی کے بعد

منتشر پتیاں خیالوں کی
پیچ کھاتی ہیں یوں ہواؤں میں
جس طرح عرش کے تمام نجوم
یک بیک اُڑ چلیں خلاؤں میں

کونپلوں سے اُگے ہیں انگارے
جنکی حدّت سے تپ رہی ہیں چمن
بن رہے ہیں گلے سڑے پتّے
کتنی جامد حقیقتوں کے کفن

روٹیاں ۔بوٹیوں سے تلتی ہیں
عصمتوں کی سبھی دوکانوں پر
پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہی
خون کا ذائقہ زبانوں پر

آدمیت پلٹ کے تکتی ہے
اپنے بچپن کے رہگذاروں کو
جیسے معزول شہر یار گئے
اپنی عظمت کی یادگاروں کو

زندگی عزم زندگی سے تہی
کارواں کے غبار میں گم ہے
زاہدِ کہنہ سال کی مانند
مقبروں کے شمار میں گم ہے

ایک آفاق گیر سنّاٹا
"زندگی! زندگی" پکارتا ہے
سٹپٹاتا ہے اپنے ہونٹوں سے
خون کی پپڑیاں اُتارتا ہے

زندگی کو سنبھالنے کی مہم
کب مقدر کے اختیار میں ہے
یہ زمیں — یہ خلا کی رقاصہ
آدمِ نَو کے انتظار میں ہے

اخترالایمان

غلام رُوحوں کا کارواں

غلام رُوحوں کے کارواں میں
جرس کی آواز بھی نہیں ہے

اُٹھو تمدّن کے پاسبانو!
تمھارے آقاؤں کی زمیں سے
اُبل چُکے زندگی کے چشمے،
نشان سجدوں کے اب زمیں سے
مٹاؤ ـــــ دیکھو چھُپا نہ لے وہ

لہو ٹپکتا ہے آستیں سے!

غلام روحوں کے کارواں میں
نفس کی آواز بھی نہیں ہے

اُٹھو، محبّت کے پاسبانو!
یہ کوہ و صحرا، یہ دشت و دریا
تمھارے اجداد گا چکے ہیں
یہاں پہ وہ آتشیں ترانہ
جو گرمیِ بزم تھا مگر اب
گزر گیا اس کو اِک زمانا

سمندِ ایام برق پا ہے
اُٹھو! کہ تاریخ ہر ورق پہ
تمھارا اُشبھ نام ڈھونڈتی ہے

نہ دیں گے آواز اس کے شہ پر
جو وقت اڑتا چلا گیا ہے
زمین آنکھوں سے مت کریدو!
نہ مل سکیں گی وہ ہڈیاں جو
زمیں کا تاریک گہرا سینہ
نگل چکا ہے — نیا قرینہ
سکھاؤ پامال زندگی کو

اُٹھو! مزاروں کے پاسبانو!
چلو نہ گرماؤ زندگی کو
یہ ڈھیر سونے پڑے ہیں، ان پر
کہیں سے دو پھول ہی چڑھادو

بلراج کومل

اکیلی

اجنبی اپنے قدموں کو روکو ذرا
جانتی ہوں تمھارے لئے غیر ہوں
پھر بھی ٹھہرو ذرا
سُنتے جاؤ یہ اشکوں بھری داستاں
ساتھ لیتے چلو یہ مجسم فغاں

آج دُنیا میں میرا کوئی بھی نہیں
میری اُمی نہیں

میرے ابّا نہیں
میری آپا نہیں
میرا ننھا سا معصوم بھیّا نہیں
میری عصمت کی مغرور کزنیں نہیں
وہ گھروندا نہیں جس کے سائے تلے
لوریوں کے ترنم کو سنتی رہی
پھول چنتی رہی
گیت گاتی رہی
مسکراتی رہی
آج کچھ بھی نہیں!
آج کچھ بھی نہیں!!

میری نظروں کے سہمے ہوئے آئینے
میری امّی کے، ابا کے، آپا کے، اور میرے ننھّے سے معصوم بھیّا کے، خوں سے ہیں دہشت زدہ
آج میری نگاہوں کی ویرانیاں چند مجروح یادوں سے آباد ہیں

آج میری اُمنگوں کے سوکھے کنول میرے اشکوں کے پانی سے شاداب ہیں
آج میری تڑپتی ہوئی سِسکیاں ایک سازِ شکستہ کی فریاد ہیں

اور کچھ بھی نہیں
بھوک مٹتی نہیں
تن پہ کپڑا نہیں
آس معدوم ہے
آج دُنیا میں میرا کوئی بھی نہیں!
آج دُنیا میں میرا کوئی بھی نہیں!!

اجنبی اپنے قدموں کو روکو ذرا
سُنتے جاؤ یہ اشکوں بھری داستاں
ساتھ لیتے چلو یہ مجسم فغاں
میری امی بنو
میرے ابا بنو

میری آپا بنو
میرے ننھّے سے معصوم بھیّا بنو
میری عصمت کی مغرور کرنیں بنو
میرے کچھ تو بنو!
میرے کچھ تو بنو!
میرے کچھ تو بنو!

جگر مُرادآبادی

غزل

چمن کے مالک اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

ہوائیں ہیں آج بھی طرب زا، درخت ہیں سایہ دار اب بھی
مگر وہ انساں کہ جسکے چھونے سے جلتے ہیں برگ و بار اب بھی

انھیں خبر کیا نہیں ہے اسکی انھیں میں ہیں فتنہ کار اب بھی
مگر وہ ہیں وقت و مصلحت کے قدیم و تازہ شکار اب بھی

اگرچہ آزادیٔ وطن کو گذر چکا ایک سال کامل
مگر خود اہلِ وطن کے ہاتھوں فضا ہے ناسازگار اب بھی

گو اپنی بدنیتی کے ہاتھوں بُرے نتیجے بھگت رہی ہیں
صداقتوں سے حقیقتوں سے وہی ہی لیکن فرار اب بھی
یہ زندگی غیر مطمئن سی شکوک و شبہات کی یہ دُنیا
مگر وہ فرمائے جا رہے ہیں کہ رشتے ہیں استوار اب بھی
زمین بدلی زمانہ بدلا مگر نہ بدلے تو وہ نہ بدلے
جو تنگ و تاریک ذہنیت تھی وہی ہی بر روئے کار اب بھی
کوئی یہ چپکے سے اُن سے پوچھے کہاں گئے آپکے وہ دعوے
نچوڑتا ہے لہو غریبوں کا دستِ سرمایہ دار اب بھی
شفارشیں ظالموں کے حق میں پیامِ رحمت بنی ہوئی ہیں
نہیں ہے شائستہ سماعت دُکھی دلوں کی پُکار اب بھی
اسی کا ہے نام اگر ترقّی ہم اس ترقّی سے باز آئے
کہ خونِ مخلوق سے خدا کی زمین ہے لالہ زار اب بھی
ہمیں ملا کر بھی خاک و خوں میں نہیں ہی وہ مطمئن ابھی تک
ہماری خاکِ لحد کے ذرّے ہیں انکے دامن پہ بار اب بھی

کہاں کی دلداری محبت۔ تلافیوں کا تو ذکر ہی کیا
حقوق پامال کر رہے ہیں حقوق کے پہرہ دار اب بھی

جو محوِ جشنِ نظامِ نو ہیں پکار کر اُن سے کہہ رہا ہوں
یہ جان ہے سوگوار اب بھی یہ دل ہی ماتم گسار اب بھی

منافرت کی ہزار باتیں وہ سُنتے رہتے ہیں اور خوش ہیں
مگر صداقت کی صاف و سادہ سی بات ہی ناگوار اب بھی

نہ وہ مروّت نہ وہ محبت نہ وہ صداقت نہ وہ شرافت
رہینِ خوف و خطر ہیں یعنی سکون و امن و قرار اب بھی

زبان و دل میں نہ ربط صادق نہ زندگی میں خلوص کامل
جو تھے غلامانہ زندگی میں وہی ہیں لیل و نہار اب بھی

غلط یہ جمہوریت کے دعوے دروغ یہ زندگی کے نقشے
دلیل اسکی یہی ہے کافی کہ ذہن ہیں تنگ تار اب بھی

یہ جشنِ آزادیِ وطن ہی مگر اسی جشن و سرخوشی میں
بہت ہیں سینہ فگار اب بھی بہت ہیں بے روزگار اب بھی

یہی جو سادہ سے قہقہے ہیں یہی جو پھیکے سے ہیں تبسّم
انھی کی تہہ میں بہت سے اشکوں کے ہیں رواں آبشار اب بھی

یہ رشوتوں کی یہ سازشوں کی یہ نفع اندوزیوں کی لعنت
وہ خود ہی انصاف سے یہ کہہ دیں نہیں وہ کچھ ذمہ دار اب بھی

ہزار ہا انقلاب دیکھے۔ ہزار ہا تجربوں سے گزرے
خرد میں تنگئ عمل ہے لغزش، جنوں ہے ناپختہ کار اب بھی

انھیں کے حلقوں سے خود انھیں کی مخالفت عام ہو رہی ہے
ہماری جانب ہے لیکن اُن کی نظر ہے بیگانہ وار اب بھی

کبھی ہوئی ہے نہ ہو سکے گی مسرّت آزادیوں کی حاصل
کہ عام انسانیت کی دُنیا ہے تشنہ و بیقرار اب بھی

وسیع ملک و رفیع فطرت خلوص نیّت خلوص ایماں
انھیں فضائل پہ ہے وطن کے وقار کا انحصار اب بھی

خلوصِ نیّت سے صرف اپنی ہی زندگی پر کریں توجہ
خلوصِ نیّت کی منتظر ہے سعادتِ کردگار اب بھی

کبھی کبھی غور کرتے رہئے جگر کا مصرعہ پڑھتے رہئے

چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

جگر کی ہے زندگی محبت نہیں، ہے اس کو کسی سے نفرت

جگر کے دل میں ہے سب کی عزت جگر ہے یاروں کا یار اب بھی

جگن ناتھ آزاد

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری
بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری
فضا میں ہر طرف کیوں دھجیاں آوارہ ہیں اُنکی
جنونِ سر فروشی تیرے افسانوں پہ کیا گزری
وصالِ شمع کی حسرت میں سب بیتاب پھرتے تھے
میں کیا جانوں حضورِ شمع پروانوں پہ کیا گزری

کہو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

نشانِ برگِ گل تک بھی نظر آتا نہیں ہم کو
سمجھ میں کچھ نہیں آتا گلستانوں پہ کیا گزری

جہاں نورِ سحر کے بھی قدم جمنے نہ پاتے تھے
بتائے کون آخر ان شبستانوں پہ کیا گزری

وہ رنگ و نور سے بھرپور بستانوں پہ کیا بیتی
شباب و شعر سے معمور کاشانوں پہ کیا گزری

ابھی تو چشمِ عبرت وقت کی رفتار دیکھے گی
ابھی یہ کس طرح کہہ دیں ستم رانوں پہ کیا گزری

نہ پوچھ آزادؔ اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ
ہوا تھا کیا یہ اپنوں کو یہ بیگانوں پہ کیا گزری

جوشؔ ملیح آبادی

ہندوستان و پاکستان کا نعرہ

(بہ سلسلۂ فتنہ و فساد)

اے ناقدِ تباہی و نباضِ روزگار
ہاں اس طرف بھی ایک نظر بہرِ کردگار
ہم ظلم کے ہیں شاہ، شقاوت کے تاجدار
انسان ہے تو ڈال ہمارے گلوں میں ہار
ابلیسیت کا مرد ہے تو۔ احترام کر
ہم ہیں امیرِ نادر و نیرو سلام کر

اے شخص ہم کو غور سے کیا دیکھتا ہے تو
ہاں ہم ہیں جور پیشہ و خوں ریز و مرگ خو
یہ دیکھ کہنیوں سے ٹپکتا ہوا لہو
بیٹوں کے سر اُڑاتے ہیں باپوں کے روبرو

ژولیدہ کاکلوں کی گھٹاؤں کے سامنے
بچوں کو بھون ڈالا ہے ماؤں کے سامنے

کس کس مزے سے ہم نے اُچھالی ہیں عورتیں
سانچے میں بے حیائی کے ڈھالی ہیں عورتیں
شہوت کی بھٹیوں میں اُبالی ہیں عورتیں
گھر سے برہنہ کر کے نکالی ہیں عورتیں

یہ لطف بھی کئے ہیں ہوس پروری کے بعد
پھاڑا ہے شرمگاہوں کو عصمت دری کے بعد

چُن چُن کے ہم نے کھائے ہیں کتنے ہی نوجواں
اطفال کے گلوں میں بھی ڈالی ہیں ریسماں

پیرانِ خستہ جاں کے بھی توڑے ہیں استخواں
گُل چہرہ عورتوں کی بھی کاٹی ہیں چھاتیاں
دو کر دیا ہے چیر کے ہم نے یقین کر
بچوں کو ان کی ماؤں کی گودی سے چھین کر

کیا کیا نہ کنواریوں کو نچایا ہے دھوم سے
کیا کیا نہ چھوکروں کو رُلایا ہے دھوم سے
بہنوں پہ بھائیوں کو گدایا ہے دھوم سے
باپوں کو بیٹیوں پہ چڑھایا ہے دھوم سے
جب بھی زنا کیا ہے تو قرباں اس آن پر
زوجہ کے سر کو رکھا ہی شوہر کی ران پر

بوجہل کی شراب سے چھلکا کے جام کو
بٹّا لگا دیا ہے محمد کے نام کو
زندہ کیا ہے راونِ دوزخ مقام کو
ہاں ہم نے رُو سیاہ بنایا ہے رام کو

قرآں کو ہم پہ فخر ہے ویدوں کو ناز ہے
سچ ہے حرامزادے کی رسّی دراز ہے

ہاں ہاں حرامزادے ہیں بے اعتبار ہیں
ہاں ہاں حرام خور ہیں انسان خوار ہیں
ہاں بانیٔ خزاں ہیں۔ عدوئے بہار ہیں
خونی ہیں۔ بدگہر ہیں۔ رذالت شعار ہیں

جس کا نتیجہ خیر ہو، تف ایسے کام پر
ہم تھوکتے نہیں ہیں شرافت کے نام پر

ہاں بوستانِ خیر کے مالی نہیں ہیں ہم
پل بھر بھی شر کے ذوق سے خالی نہیں ہیں ہم
جس میں لچک کی خو ہو وہ ڈالی نہیں ہیں ہم
ہم کو یہ فخر ہے کہ حلالی نہیں ہیں ہم

ہم وہ حیا پرست وہ غیرت پسند ہیں
بہنوں ہی پر ہیں بند نہ ماؤں پہ بند ہیں

ہم اور اپنی قوم کے سردار کیا کہا
ہم اور قصرِ ملک کے معمار کیا کہا
ہم اور سلطنت کے خریدار کیا کہا
ہم اور حرّیت کے سزاوار کیا کہا

عالم سے کچھ غرض ہے نہ عامی سے کام ہے
بابا ہمیں تو صرف غلامی سے کام ہے

مجبوریوں کو تج کے خریدیں گے اختیار
پائیں گے دین بیچ کے دنیا کا اقتدار
دیر و حرم کو چھوڑ کے مانند اہلِ نار
ہم اور سلطنت کا سنبھالیں گے کاروبار

سر اپنے لیں گے قوم کی اس ہائے ہائے کو
اور چھوڑ دیں گے اونٹ کو تج دینگے گائے کو

جب تک کہ دم ہے ہندو و مسلم کے درمیاں
ہاں ہاں چھڑی رہے گی یونہی جنگ بے اماں

اُلجھی رہیں گی شام و سحر زیر آسماں
یہ چوٹیاں سروں کی یہ چہروں کی داڑھیاں

ہاں ہوش میں قتال کا بھنگی نہ آئے گا
جس وقت تک پلٹ کے فرنگی نہ آئے گا

ساحر لدھیانوی

آج

ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لیے
چاند، تاروں، بہاروں کے سپنے بُنے
حسن اور عشق کے گیت گاتا رہا
آرزوؤں کے ایواں سجاتا رہا
میں تمہارا مغنّی، تمہارے لیے
جب بھی آیا، نئے گیت لاتا رہا

آج لیکن مرے دامنِ چاک میں

گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں
میرے بربط کے سینے میں نغموں کا دم گھٹ گیا ہے
تانیں چیخوں کے انبار میں دب گئی ہیں
اور گیتوں کے سُر ہچکیاں بن گئے ہیں

میں تمہارا مغنّی ہوں، نغمہ نہیں ہوں
اور نغمے کی تخلیق کا ساز و ساماں
آج تم نے جلا کر بھسم کر دیا ہے
اور میں اپنا ٹوٹا ہوا ساز تھامے
سرد لاشوں کے انبار کو تک رہا ہوں
میرے چاروں طرف موت کی وحشتیں ناچتی ہیں
اور انساں کی حیوانیت جاگ اٹھی ہے
بربریت کے خونخوار عفریت
اپنے ناپاک جبڑوں کو کھولے
خون پی پی کے غرا رہے ہیں

بچّے ماؤں کی گودوں میں سہمے ہوئے ہیں
بہنیں بے حرمتی کے تصوّر سے لرزاں ہیں، افسردہ ہیں ــــ بھائی مجبور ہیں
ہر طرف شورِ آہ و بکا ہے
اور میں اس تباہی کے طوفان میں
آگ اور خوں کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہوں
مجکو امن اور تہذیب کی بھیک دو،
میرے گیتوں کی لَے، میرے سُر، میری نَے
میرے مجروح ہونٹوں کو پھر سونپ دو

ساتھیو! میں نے برسوں تمھارے لئے
انقلاب اور بغاوت کے نغمے الاپے
اجنبی راج کے ظلم کی چھاؤں میں

سرفروشی کے خوابیدہ جذبے اُبھارے
اور اُس صُبح کی راہ دیکھی
جس میں اُس مُلک کی رُوح آزاد ہو

آج زنجیرِ محکومیت کٹ چکی ہے
اور اس مُلک کے بحر و بر، بام و در
اجنبی قوم کے ظلمت افشاں پھریرے کی منحوس چھاؤں سے آزاد ہیں
کھیت سونا اُگلنے کو بیتاب ہیں
وادیاں لہلہانے کو بےچین ہیں
کوہساروں کے سینے میں ہیجان ہے
سنگ اور خشت بیخواب و بیدار ہیں
اُن کی آنکھوں میں تعمیر کے خواب ہیں
اُن کے خوابوں کو تکمیل کا رُوپ دو
ملک کی وادیاں، گھاٹیاں، کھیتیاں
عورتیں، بچیاں،

ہاتھ پھیلائے خیرات کی منتظر ہیں
ان کو امن اور تہذیب کی بھیک دو
ماؤں کو ان کے ہونٹوں کی شادابیاں ——!
ننھے بچّوں کو اُن کی خوشی بخش دو،
ملک کی روح کو زندگی بخش دو،
مجھ کو میرا ہنر، میری لے بخش دو،
میرے سُر بخش دو، میری نے بخش دو،
آج ساری فضا ہے بھکاری
اور میں اس بھکاری فضا میں
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
دربدر پھر رہا ہوں
مجھ کو پھر میرا کھویا ہوا ساز دو
میں تمھارا مغنّی تمھارے لئے
جب بھی آیا، نئے گیت لاتا رہوں گا

سردار جعفری

آنسوؤں کے چراغ

ہندوستان کے شرنارتھیوں
اور پاکستان کے مہاجرین کے نام

۱

میں سُن رہا ہوں
وہ سسکیاں جو زمیں کے سینے میں داغِ غم بن کے رہ گئی ہیں
وہ ہچکیاں جن کے سخت پھندے
رباب و بربط کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں
وہ آہیں جو ظالموں کے ڈر سے

دلوں میں محبوس ہو گئی ہیں
وہ چیخیں جو مادرِ وطن کی
جراحتوں کے ہجوم میں جا کے کھو گئی ہیں
وہ گیت جو نوحہ و فغاں کے
سیاہ خانوں میں چھُپ گئے ہیں
وہ ہمہمے جو فریب کاری کے سبز باغوں میں سو گئے ہیں
وہ سازشیں جن کا زہر کام و دہن کو بیکار کر چکا ہے
وہ عہدے جن کا نکیلا نشتر رگوں کے اندر اُتر چکا ہے
وہ عہد و پیماں
کہ جن کے حرفوں سے وقت و تاریخ کی جبیں پر
سیاہ دھبے پڑے ہوئے ہیں

۲

یہ کون ظالم ہے جس نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے
وطن کے سینے پہ خونِ ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی

یہ کیا ہوا ایک دم سے محفل میں سارے سازوں کے راگ بدلے
قدامتوں کے کھنڈر میں ماضی کے بھوت دیوانہ وار ناچے
بہار کے سُرخ آنچلوں سے خزاں کے بیمار رنگ برسے
سحر کی رنگین وادیوں میں سیہ بگولے مچل رہے ہیں
ہزاروں سورج نکل نکل کر گہن کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں
ہرے بھرے کھیت گرم شعلوں کے پیرہن میں دہک رہے ہیں
شگوفے لپٹے ہوئے دھوئیں کے سیہ کفن میں سُلگ رہے ہیں
کٹے ہوئے ہاتھ اپنی باہوں سے راہ روکے کھڑے ہوئے ہیں
پھٹے ہوئے آنچلوں کے ٹکڑوں میں عصمتوں کی جوان لاشیں
چھدی ہوئی دھرم اور مذہب کے خنجروں میں دلوں کی قاشیں
کٹی ہوئی چھاتیوں کی نس نس سے دودھ خوں بن کے رِس رہا ہے

۳

یہ رات ہے کس قدر بھیانک
یہ خواب ہے کس قدر پریشاں

ہزاروں سہمی ہوئی نگاہیں
بلکتی آنکھیں، سسکتی پلکیں
اندھیری شب میں
کروڑوں اشکوں کے جھلملاتے چراغ لے کر
ہجوم میں قاتلوں کے انصاف کے فرشتے کو ڈھونڈتی ہیں

مگر میں یہ پوچھتا ہوں تم سے
شریف بہنو
غیور ماؤ
تمہاری آنکھوں میں بجلیوں کی چمک کے بدلے
یہ آنسوؤں کا وفور کیوں ہے

میں جانتا ہوں
تمہارے سینے میں، دل میں، زخموں میں، کتنے آنسو بھرے ہوئے ہیں
تم ان کی بوندوں سے آسمان و زمیں کا دامن بھگو چکی ہو

تم اس تلاطم میں وندھیا اور ہمالیہ کو ڈبو چکی ہو
مگر یہ خوننابہ بار آنکھوں کی بہتی گنگا
زمیں پہ پھیلے ہوئے لہو کے سیاہ دھبے نہ دھو سکے گی
یہ جھلملاتے ہوئے دیئے ہیں
جو ظلم کے جھکڑوں مصیبت کی آندھیوں میں نہ جل سکیں گے
تم ان کی مدھم سی روشنی میں
حسین انصاف کے فرشتے کو کب تلک ڈھونڈھتی رہو گی
کہ وہ بھی اس مستقل وطن میں
تمھاری ہی طرح، زخم خوردہ ہے، اور آوارہ پھر رہا ہے

۴

یہ کس سے فریاد کر رہی ہو
یہ کس کو آواز دے رہی ہو
تم اپنے زخموں کی راکھیاں لے کے کس کی محفل میں جا رہی ہو

تمھارے یہ راہبر نہیں ہیں
تمھارے یہ دادگر نہیں ہیں
یہ کاٹھ کی پتلیاں ہیں جن کو
سیاسی پردوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے مداری
سفید ریشم کی ڈوریوں پر نچا رہے ہیں
یہ سامراجی بساطِ شطرنج کے پیادے ہیں جن کو شاطر
ہزار چالوں سے شاہ و فرزیں بنا بنا کر چلا رہے ہیں
یہی تو ہیں وہ جنھوں نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے
وطن کے سینے پہ خونِ ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی
انھیں نے محفل کے ساز بدلے
انھیں نے سازوں کے راگ بدلے
یہی تو ہیں جو تمھارے اشکوں سے اپنے موتی بنا رہے ہیں
تمھاری عصمت، تمھاری عزت، تمھاری غیرت چرا رہے ہیں

یہ قصر وہ ہے کہ جس کے دیوار و در میں صدیوں کی لعنتیں بس کے رہ گئی ہیں

یہ تاج وہ ہے کہ جس کی ضو میں
وطن کے چہرے کا رنگ تحلیل ہو گیا ہے
یہ تخت وہ ہے کہ جس کے پائے
ہمارے دل میں گڑے ہوئے ہیں
یہ فرش وہ ہے جہاں فرنگی کے بھوت دن رات چل رہے ہیں
یہاں شہیدوں کا خوں چھلکتا ہے موجِ رنگ شراب بن کر
یہاں بلکتا ہے دردِ دل کا سرودِ چنگ و رباب بن کر
یہاں امیدوں کے پھول اور آرزو کے غنچے نہ کھل سکیں گے
یہاں تمھیں عدل اور انصاف کے فرشتے نہ مل سکیں گے
یہ ظالموں کا محل ہے، یہ قاتلوں کا مسکن ہے، یہ لیٹروں کی انجمن ہے

۵

شریف بہنو، غیور ماؤ
تمھارے بھائی
تمھارے بیٹے

تمھاری فریاد سُن رہے ہیں
ملوں سے، کھیتوں سے، اور کانوں سے تم کو آواز دے رہے ہیں
وہ دیکھو ان کے جوان سینوں میں عدل اور انصاف کی جوالا بھڑک رہی ہے
نگہ میں بجلی چمک رہی ہے
اندھیری شب سے پرے شفق کی سُنہری مینا چھلک رہی ہے

وہ اپنے سینے کا سوز لائیں
میں اپنے نغموں کی آگ لاؤں
تم اپنی آہوں کی مشعلوں کو جلا کے نکلو
ہم اپنی روحوں کی تابناکی سے اس اندھیرے کو پھونک دیں گے
کہ جس کے منحوس دامنوں میں
گناہ پروان چڑھ رہے ہیں

غلام ربانی تاباں

انتقام

میں کس سے انتقام لوں —
یہ سچ ہے بیکسوں کے خوں سے سُرخ ہوگئی زمیں
مصیبتوں کی داستاں میں سُن چکا ہوں ہمنشیں
میں سُن چکا ہوں کِس طرح بزرگ و ناتوان بھی
بلکتے شیر خوار بھی فسُردہ نوجوان بھی
اجل کے گھاٹ ایک ایک کرکے سب اُتر گئے
گھروں کی شاہزادیاں — حریم ناز کی مکیں
(جو عفتیں گنوا چکیں — جو عصمتیں لُٹا چکیں)
بھٹک رہی ہیں در بدر

برہنہ پا — برہنہ سر

میں سُن چکا ہوں ہمنشیں یہ داستانِ دلخراش
مگر کسے میں دوش دوں
میں کس سے انتقام لوں

تباہیوں کی گود کے پلے ہوئے کسان سے —؟
کہ جنگِ انقلاب کے سپاهی — نوجواں سے —؟
غریب و ناتوان سے —؟
نہیں نہیں!!
یہ سب مرے عزیز ہیں — یہ سب مجھے عزیز ہیں
میں کس سے انتقام لوں
بتا کسے میں دوش دوں
چمن میں کس نے آگ دی ہے موسمِ بہار میں
اِک اجنبی سفید ہاتھ — آتشیں و شعلہ بار
فضائے تیرۂ وطن میں رقص کر رہا ہے آج

فکرؔ تونسوی

قافلہ

کہاں چلے ہو ساتھیو ـــــ؟
لہو لہو نگاہ میں غمِ نہاں لئے ہوئے
چھلکتے آنسوؤں میں دردِ بیکراں لئے ہوئے
لبوں پہ ایک تشنگی کہ جیسے کوئی آکے جوئبار سے پلٹ چلے
کہ جیسے اِک ستارہ ٹوٹ کر فضائے تیرگی میں ڈوب جائے
کہ جیسے ایک گیت چیخ بن کے تھرتھرائے
میں سوچتا ہوں تم اُمنگ بن کے سینۂ زمیں میں کیوں رہے ـــ؟
اگر رہے تو پھوٹ کر شگفتہ پھول کیوں بنے ـــ؟

اگر ہے تو کیوں نہ دستِ گلفروش کی لپک جھپٹ سے بچ سکے ۔۔؟
گلو! حسیں گلو ۔۔۔ فسردگی کی صورتو! کہاں چلے؟
اُٹھا کے زرد لاش اپنے نغمہ ہائے شوق کی
سنبھال کر دلوں میں بے بسی کی چند دھڑکنیں
نکل کے اپنی وادیوں سے! ڈھونڈتے ہوئے بہارِ بے مقام کو
بچھڑ کے اپنے گیت سے، فلک سے اپنے لُوٹ کر
طلسمِ دستِ گلفروش کے اثر سے بے خبر
کہاں چلے ہو دوستو ۔۔؟

۲

کہاں ملو گے دوستو ؟
اُفق کی اس لکیر پر ۔۔؟
سُنا رہی ہے آسماں کو جو زمیں کی داستاں
کہ ہم نے کیسے اپنی بے بسی کے راز بیچ کر
بنا دیا تھا چند تاجروں کو پاسبان چارسو
لڑے تھے ہم! جلے تھے ہم، بہی تھیں خوں کی ندیاں

مگر جب ایک دن کہ اپنے گیت جا رہے تھے چیختے ہوئے
اُٹھے اور ہم نے اپنے راز بے بسی کو پالیا
بڑھے اور ہم نے اپنی کھیتیوں کے، وادیوں کے راستے کو جالیا
بچھڑ کے مل گئے اُفق کی لالہ گوں لکیر پر
وہاں، جہاں پہ زندگی ہے آپ اپنی دھڑکنوں کی پاسباں
وہاں، جہاں پہ دستِ گلفروش بھی رسا نہیں
جہاں بہار — بے نشاں نہیں — روش روش پہ گھومتی ہے بے خطر
طلسم تاج و رنگ و نسل کے اثر سے بے خبر
— وہاں ملو گے ساتھیو!
— وہاں ملو گے ساتھیو!!

قتیل شفائی

پڑوسی

محبّتوں کی عبادت کا دَور ختم ہوا
مسرّتوں کے ہیولے جھجک کے تھم سے گئے
ہوس کا رُوپ کچھ ایسا خلا میں لہرایا
جوانیوں کے بگولے بدن میں خَم سے گئے
وہ حسرتیں وہ اُمنگیں خیال و خواب ہوئیں
نظر اُٹھی تو وہ ہم سے گئے ہم اُن سے گئے

دلوں کے گرم تقاضے غبار بن کے اُڑے
وفائیں ہانپ گئیں زر نواز راہوں میں

لچک کے ٹوٹ گئے اشتیاق کے جھولے
رہے نہ شوخ بُلاوے گداز باہوں میں

لبوں پہ ناچتی شوخی کا ساتھ چھوڑ دیا
سمٹ کے رہ گئے شکوے گلے نگاہوں میں

کبھی نگاہ میں جگنو سے رقص کرتے تھے
مگر خیال میں شعلے سے اب بھڑکتے ہیں
کبھی جبیں پہ ستارے سے جگمگاتے تھے
مگر دماغ میں کوندے سے اب لپکتے ہیں
کبھی رگوں میں رواں تھے بہشت کے جھونکے
مگر لہو میں جہنم سے اب دہکتے ہیں

کیفی اعظمی

قومی حکمراں

سامراجی فضا شناسوں نے
وقت کے تیوروں کو بھانپ لیا
منتخب کرکے جانشیں ناگاہ
مُنھ ترنگے سے اپنا ڈھانپ لیا

رہزنوں سے مفاہمت کرکے
راہبر قافلہ لُٹاتے ہیں
لینے اُٹھے تھے خون کا بدلہ

ہاتھ جلاد کا بٹاتے ہیں

کس طرف جائیں خانماں برباد
بٹ کے جیسے سکڑ گئی ہے زمیں
جس شجر کو لہو سے سینچا ہے
اس میں کانٹے ہیں لاکھ چھاؤں نہیں

کتنے کھلیان لوٹے جاتے ہیں
نفع خوروں کی بوریوں کے لیے
قطرہ قطرہ نچوڑا جاتا ہے
خوں سر جوئی تجوریوں کے لیے

فکر پابند ہے عمل پابند
ڈھال رکھی ہیں کتنی زنجیریں
بابِ زنداں میں لکھی جاتی ہیں

آج جمہوریت کی تفسیر میں

بیگناہوں کے خوں کی بارش میں
بزمِ عشرت سجا کے بیٹھے ہو
اُٹھ بھی سکتی ہیں دفعتاً لاشیں
جن پہ مسند بچھا کے بیٹھے ہو

جب بھڑکتی ہے انقلاب کی آگ
کوئی اس کو بجھا نہیں سکتا
کام جو پیش رو نے سونپا ہے
تم سے انجام پا نہیں سکتا

منظور احمد منظور

رِستے ناسور

خزاں کے پہلو میں توڑتے دم حسیں بہاروں کو میں نے دیکھا
بگڑتے بن بن کے دستِ فطرت کے شاہکاروں کو میں نے دیکھا
الم کے ظلمت نشاں جھروکوں میں ماہ پاروں کو میں نے دیکھا
فضا کے انفاس سے برستے لہو کے دھاروں کو میں نے دیکھا
جمیل نظارۂ شفق کا اُڑا اُڑا رنگ میں نے دیکھا
بشر کے نازک بدن پہ ہستی کا پیرہن تنگ میں نے دیکھا
ٹپکتے دیکھا اجل کے جبڑوں سے زہر آلود جھاگ میں نے
بطونِ گیتی سے اُٹھتے دیکھے دھوئیں کے پُرپیچ ناگ میں نے

اُڑے اُڑے خاک دانوں میں دیکھے جبین و چشم و غذا میں نے
جنوں کا عفریت ابنِ آدم کے سر پہ دیکھا سوار میں نے
رُکی رُکی نبضِ حال دیکھی، مری مری اسکی چال دیکھی
اجل کے سنگیں قدم کے نیچے روِش روِش پائمال دیکھی

کرن کرن منتشر ہوئی ہے ہزار ہا آفتاب ٹوٹے
فضا میں نغمے بکھر گئے اس طرح سے تارِ رباب ٹوٹے

قبائے ہوش و خرد کو میری نگاہ نے تار تار دیکھا
ہر ایک پہلو کے تبکدے میں کشیدگی کا غبار دیکھا
جوان بیٹے کے سرد لاشے پہ مامتا کا جلال دیکھا
نزولِ شبنم کی جگہ آنکھوں میں بجلیوں کا جمال دیکھا
وہ اس کا مجروح ناگنوں کی طرح غم و اضطراب دیکھا
جو دل شناسائے نیشِ غم تھا اسی کو وقفِ عتاب دیکھا

بلکتے بچوں کو میں نے دیکھا سسکتی ماؤں کی گودیوں میں
ہوا کی چیخیں سُنی ہیں میں نے خنک فضاؤں کی گودیوں میں

نچے نچے بال و پر بھی دیکھے لُٹے لُٹے کارواں بھی دیکھے

زمیں کی چھاتی کا بوجھ بن کر جھُکے جھُکے آسماں بھی دیکھے
لہو سے لَت پَت سمن بروں سے پٹے ہوئے رہگذار دیکھے
قدم قدم پر نئے گھروندے کہ خستہ بام و خستہ مزار دیکھے
یہاں نہ دستِ دُعا اُٹھے گا یہاں نہ کوئی دیا جلے گا
یہاں کوئی دل کا نرم جذبہ نہ گوہرِ اشک میں ڈھلے گا
جُدا جُدا پیڑ پیڑ دیکھا، الگ الگ ڈال پات دیکھے
بچھڑے ہوئے میں نے جسم دیکھے کٹے ہوئے میں نے ہات دیکھے
پھٹی پھٹی مضمحل نگاہوں میں آنسوؤں کے چراغ دیکھے
خجل تھا جن سے قمر بھی اُن عارضوں پہ زخموں کے داغ دیکھے
فضا کے تنورِ آتشیں سے برستے سنگ و شرار دیکھے
ہوس کے ہاتھوں حریر و دیبا کے پیرہن تار تار دیکھے
سُنا رہی ہیں فسانہ کیا کیا جھُکی جھُکی منفعل نگاہیں
رُندے رندے بے وقار جذبے گھٹی گھٹی سوگوار آہیں
چھُوا، نہ جن کو شعاعوں نے بھی ستم دِل پہ اُنکے روا نہیں ہے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ بیکسوں کا خدا نہیں ہے

مُنیب الرّحمٰن

روحیں

دشت میں بھٹکی ہوئی روحوں کی آواز سنو
شور۔ ہیجان۔ کشاکش۔ چیخیں
آہ و فریاد و فغاں
سخت ناقابلِ تفہیم مگر
اپنے ابہام میں تفسیر کا انداز لئے
سُنو آواز سُنو
ناتواں بچّوں کے چلّانے کی
سنکھ کی۔ نعرۂ تکبیر کی۔ بجے کاروں کی

عورتوں کی جو گراچاہتی ہیں
ننگ و رسوائی کے ناپید اکراں غاروں میں
دیکھو۔ ہستی کے تڑپنے کے نظارہ دیکھو
سُنو۔ سر مستِ جنوں۔ روحوں کی آواز سُنو

کل کے افسانے کا اِک باب تھا جو آج ہوا
ہم پہ موقوف تھا سب بننا بگڑنا اس کا
ابتدا۔ انتہا۔ آغاز و مآل
طرزِ تحریر، اسالیب بیاں، حُسنِ خیال
سب پہ ہم پوری طرح قادر تھے
ہم اگر چاہتے عنوان بدل سکتے تھے
نفسِ مضمون کے ارکان بدل سکتے تھے
کچھ نہ ہوتا تو یہ اوضاعِ پریشان بدل سکتے تھے
نیتیں اپنی مگر پاک نہ تھیں
ہم نے دانستہ اِسی جُرم کا اقدام کیا

جس سے لازم تھا گریز
نفرتیں بوئی گئیں
کھوٹ ڈالا گیا معصوم دلوں کے اندر
شک و شبہات کی دیواریں اُٹھائی گئیں ہر سینے میں
اور جو کام محبّت سے نکل سکتا تھا
کینۂ و ظلم پہ مشروط کیا اس کا حصول
روحیں بیدار ہوئیں
کوہساروں سے صدائیں اُٹھیں
لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے صدائیں اٹھیں
لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے۔ فلک آشنا کہساروں سے پھیلے ہوئے میدانوں سے
بیباک صدائیں اُٹھیں

خون کا خون! عداوت کا عداوت سے صلہ
ہر طرف لاشوں کے پشتارے تھے
خون میں لتھڑے ہوئے جسم بھٹکتی لاشیں
سر بریدہ! مگر افلاک کی جانب نگراں

اور جو کچھ نہ ہوا تھا وہ ہوا

دشت میں بھٹکی ہوئی روحوں کی آواز سنو
چند روز اور ابھی گونجیں گی ان کی چیخیں
چند روز اور ابھی اُٹھیں گے ان کے نوحے
چند روز اور ابھی دشت میں یہ ناچیں گی
اور پھر ناگہاں چھا جائے گی خاموشیِ مرگ
اور یہ اپنے تئیں سوچیں گی
ہم تو روحوں کے سوا کچھ بھی نہیں

نریش کمار شاد

آزادی کے بعد

نغمہ افروز فضاؤں پہ مسلّط ہے سکوت
ایک وحشت سی در و بام پہ لہراتی ہے
تیرگی ایک مچلتے ہوئے دریا کی طرح
موج در موج ہر اک سمت بڑھی آتی ہے

اُجڑے اُجڑے ہوئے خاموش سے بازاروں میں
رقص کرتا ہے سلگتے ہوئے ملبوں کا دھواں
شاہراہوں پہ بنی نوع کے مردہ ڈھانچے
اپنی چپ چاپ زبانوں سے ہیں فریاد کناں

بھوک اور پیاس کی ماری ہوئی اندھی مخلوق
مذہب و نسل کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
اک نئے دور کے خوابوں کا اثاثہ لے کر
کینۂ و بُغض کے شعلوں سے جلی جاتی ہے

ہائے یہ لوگ کہ آزاد بھی ہو کر ان میں
اپنا ماحول بدلنے کی فراست ہی نہیں
ان کی شریانوں میں جاری ہے غلامی کا لہو
ان کے سینوں میں ابھی جذبۂ غیرت ہی نہیں

کون ان خاک میں روندے ہوئے ایوانوں پر
اپنی آزاد حکومت کا علم لہرائے
اور ان خون سے کفنائی ہوئی لاشوں پر
جشنِ آزادیٔ جمہور کے نغمے گائے

واثق جونپوری

ماں

کس نے ان آہنی دروازوں کے پٹ کھول دیئے
کس نے خونخوار درندوں کو یہاں چھوڑ دیا
کس نے آنچل پہ مرے ڈال دیئے انگارے
ٹھیک سے کٹنے بھی پایا نہ تھا طوقِ گردن
ابھی تو صدیوں کا پامال تھا میرا خرمن
اس پہ ان وحشی لٹیروں نے سیہ کاروں نے
میرے ارمانوں کو تاراج کیا لوٹ لیا

میرے معصوموں کو بے خانماں و برباد کیا
میری بہوؤں سے ہوس خانوں کو آباد کیا
جل گیا میرا چمن لٹ گئی سب میری بہار
میرے بربط میں کوئی تار نہیں اب ثابت
میری چیخوں میں کوئی درد نہیں اب باقی

میرے پیارو مری چھاتی سے لپٹنے والو
آگ وہ دل میں لگی ہے کہ میں ہی جانتی ہوں
یوں مری کوکھ جلی ہے کہ میں ہی جانتی ہوں
میرے بچو مری ناموس کے پہریدارو
دیکھو نیزوں پہ تمھارے ہیں یہ کس کی لاشیں
تم نے خود لوٹ لیا اپنی ہی بہنوں کا سہاگ
مانگ میں جھونک دی سیندور کی جگہ تم نے آگ
شرم سے اب تو ہوئی جاتی ہے گردن مری خم
(پانی پانی ہوا جاتا ہے مصور کا قلم)

یہ ترا بیت مقدس تری رفعت کا مزار
کس کی منحوس نگاہوں کا بنا آج شکار
کیا ہوئے میرے وہ منصوبے وہ خوابِ فردا
جل گیا میرا چمن لُٹ گئی سب میری بہار
میرے بربط میں کوئی تار نہیں اب ثابت
میری چیخوں میں کوئی درد نہیں اب باقی